مصائب و آفات کو امام کیا

مصنّف

صلاح الدّین عادل

ناشر
پاپولر پبلشرز۔ ۲۶ لٹن روڈ۔ لاہور

بار ———————— اوّل
اشاعت ———————— ستمبر ۱۹۹۵ء
مطبع ———————— نیو فائن پرنٹنگ پریس لاہور
[redacted]

دَرد آشنائی کا سفر

"آؤ شرجیل میاں! کیسے ہو؟ کریم، میرے ملازم نے مجھے بتایا ہے کہ تم تین بار میرے شہر والے مکان پر آئے تھے، تیمار داری کو۔ ملاقات اس لئے نہ ہو سکی کہ دو بار میں بخار میں بیہوش پڑا تھا، تیسری بار نقاہت کے سبب غنودگی میں تھا اور ڈاکٹر نے ہر طرح کی گفتگو اور ذہنی ارتعاش سے منع کر رکھا تھا، چوتھی دفعہ جب تم گئے تو میں اپنے آبائی گاؤں تبدیلیٔ آب و ہوا اور صحت کی بحالی کے لئے جا چکا تھا۔ میں خوش نصیب ہوں کہ تم جیسے ہمدرد میرے لئے دُعا گو ہیں۔"

"اِس بہانے ایک ایسی محترمہ سے ملاقات ہوگئی جو آپ کے والد کے عزیز ترین دوست کی بیوہ ہیں۔ انہوں نے آپ کے متعلق بہت سی باتیں بتائیں اور چائے بھی پلائی اور اپنے طرزِ عمل سے سمجھایا کہ نانی اور دادی کا پیار کیا ہوتا ہے۔ عجب نستعلیق عورت ہیں۔ خوشی ہے کہ ایسے لوگ دُنیا میں ہیں۔ ایسے انسانوں سے اِس دُنیا کا بھرم قائم ہے۔ ..... ایسے ہی ایک انسان کے لئے میرے کالج کی یونین ایک محفل برپا کرنا چاہتی ہے۔ وہ آپ کے پُرانے نیاز مند ہیں۔ جن دنوں آپ ہمارے کالج میں "طب اور فلسفۂ اخلاق" پر لیکچر دے رہے تھے تو انہوں نے آپ کو پہچان لیا کہ آپ تو میڈیکل کالج

کے پرانے اور نامور طالب علم ہیں۔ بشیشر ناتھ ہمارے لائبریرین ہیں اور ملازمت کی مدت مکمل کر کے سُبکدوش ہو رہے ہیں۔ ہم انہیں الوداعی دعوت دے رہے ہیں اور ایک ہزار روپے کی تھیلی اُن کی نذر کرنا چاہتے ہیں۔

اِس تقریب کے لئے بشیشر ناتھ صاحب کا اِصرار ہے، اور اُن کے مدّاح بھی چاہتے ہیں کہ آپ اِس تقریب کے صدرنشین ہوں اور تھیلی بھی آپ ہی اُن کو پیش کریں.... آپ کو اس تقریب میں شرکت پسند نہیں ؟"

"یہ بات نہیں۔ میں ماضی کے دُھندلکوں میں بشیشر ناتھ کے حوالے سے اپنی صورت کو تلاش کر رہا تھا۔۔۔"

"وہ آپ کو اپنا گُرو اور اُچاریہ کہتے ہیں۔"

"یہ اُن کی مہربانی ہے۔ علم کی چاہت ہم دونوں میں قدرِ مشترک تھی۔ وہ لائبریری میں چپڑاسی تھے اور مجھے کتابوں کی اکثر ضرورت رہتی تھی۔ لہذا دوستی ہو گئی۔ علم کے لئے اُن کی چاہت کا پتہ چلا تو میں نے اُن کی حوصلہ افزائی کی اور اس سلسلے میں اُن کے ساتھ کچھ منزلیں بھی طے کیں۔"

"اُن کو سب کچھ یاد ہے۔ ایک دن گھنٹہ بھر لائبریری کے اوقات کے بعد اُن یادوں کو تازہ کرتے رہے۔ آپ اِس تقریب میں شامل ہوں گے نا؟"

"یقیناً! اُن دنوں میں تمہاری طرح نوجوان تھا، اپنے آپ سے بہت سی توقعات تھیں، مستقبل سے بہت سی اُمیدیں وابستہ تھیں۔ اُستاد اور ہم جماعت علم دوست تھے، اچھے انسان تھے، ماسوا ایک آدھ کے۔"

"ایک ننھی مُنّی تقریر ہو سکے گی؟"

"ہاں، میاں۔ ضرور"

شرجیل ایک مختصر لمحے کے لئے، جو متین صاحب کو کافی طویل لگا، خاموش رہا

اور پھر اُٹھ کھڑا ہوا اور اجازت طلب کی۔

"جو خاص بات تم کرنا چاہتے تھے وہ تو تم دل ہی میں لئے جاتے ہو۔ ہمارے آپس کے تعلقات یقیناً ایسے ہیں کہ تم کُھل کر بات کرسکو۔ جو بات زبان تک آجائے اُسے واپس دل میں نہیں لوٹاتے۔ گُپت گھاؤ لگاتی ہے، ایسی بات۔ ایسے گھاؤ سے اپنے آپ کو ہمیشہ بچانا چاہیئے۔ ایسے گھاؤ جوانی ویران کردیتے ہیں۔ اطمینان سے بیٹھ کر بتاؤ کیا بات ہے جو تم کرنے کے لئے آئے اور کہنے سے گریز کیا۔"

"میں کبھی وقت پھر آجاؤں گا۔"

"آج اور ابھی کیوں نہیں؟"

"میں نے چند لمحے پہلے آپ کی آنکھوں کی گہرائیوں میں اُس صدمے کی پرچھائیں دیکھی ہیں جو آپ پر حال ہی میں بیت گیا اور آپ کی علالت کا سبب بنا۔ میں کانپ گیا کہ ہوسکتا ہے میری بات سے آپ پر کوئی اور صدمہ بیت جائے۔ آپ مجھے بہت عزیز ہیں۔ اس لئے میں آپ کو صدمہ پہنچانے کا تصوّر بھی نہیں کرنا چاہتا۔"

"میرے بیٹے! تمہارا قیاس صحیح ہے۔ میری علالت ایک صدمے ہی کا نتیجہ تھی مگر اِس صدمے اور اس بیماری سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے اور اپنی شخصیت کے ارتقا کی چند منزلیں بہت تیزی سے طے کیں ہیں۔ اس لئے صدمے اور بیماری کے لئے ربّ العالمین کا شکرگذار ہوں۔"

"آپ نے کیا عجب عجیب بات کہہ دی ہے۔ کیا صدمہ اور بیماری ـــ دُکھ اور درد اِک نعمت ہوسکتے ہیں؟ کیسے؟ مجھے آپ کے لیکچروں کے چند فقروں نے بہت چونکایا اور ویران کیا تھا۔ یہ فقرے عجیب بھی لگے اور بھلے بھی۔ میں کبھی کبھی گھر میں کام کرتے ہوئے، پڑھتے ہوئے، کالج میں کسی سے باتیں کرتے ہوئے، کھوجاتا رہا ہوں اُن فقروں کی فضا میں، مگر میں اُس فضا کا احاطہ کبھی نہیں کرپایا۔ مجھے سمجھائیں دُکھ درد اور انسانی زندگی کا

رشتہ کیا ہے اور یہ رشتہ لازم کیوں ہے؟ .... آپ نے کہا تھا:۔

"درد کوئی شے نہیں کہ اِس کو انسانی زندگی سے نکال باہر پھینکنا لازم ہو۔ درد اِک للکار ہے جو انسان کو کہتی ہے: ہوشیار! اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کو اکٹھا کرو، مربوط کرو، منظّم کرو، کہ تم میں اِک وحدت جنم لے، اِس وحدت کے ذریعے سے اپنے گردوپیش میں موجود کثرت کی وحدت میں صورت گری کرو تاکہ تمہارے معاشرے کو کشمکش، افراتفری اور آپا دھاپی کی بجائے معاشرتی اِرتقاء کی طرف لے جائے۔ بالکل اِسی طرح درد خطرے کا پیشگی الارم دے کر خبردار کرتا ہے کہ جسمانی عوامل کی باہمی کشمکس کا اس طرح علاج کرو کہ بیماری کی بجائے صحت پروان چڑھے، ورنہ بیماری صحت کو برباد کر دے گی۔ یوں یہ خطرے کی گھنٹی آنے والی بیماری کے سدِّباب کا سبب بن جاتی ہے۔ اگر بیماری یکایک آجائے تو انسان کو بےبس کر دے اور انسان کو موت سے ہم کنار کر دے۔"

"سائنس دان اِنسان کو حیوان قرار دیتے ہیں: کوئی اُسے حیوانِ ناطق، کوئی اُسے حیوانِ حکیم، کوئی اُسے حیوانِ صانع قرار دیتا ہے اور اپنی تعریف کے مطابق مقدرِ اِنسانی کی بات کرتا ہے، اِس کی تفسیر کرتا ہے۔ مگر میرے نزدیک انسان حیوانِ بااختیار ہے جس کی کوئی فطرت نہیں، جس کا اختیار بہت وسیع، جس کی حدود نامعلوم، اگرچہ خدا کے مقابلے میں محدود اور مسدود ہیں۔ انسان کو اُس کے خالق خدا نے بااختیار اس لئے بنایا کہ وہ اُس کے اسما کو اپنے اندر رچائے اور اپنی صورت گری اِس طرح کرتا چلا جائے کہ وہ اِس جہانِ رنگ و بُو اور زمان و مکان کو تسخیر کر کے اُس کی قوتوں کو تمام انسانوں کی فلاح کے لئے وقف کر دے لیکن اس اختیار کا لازمی نتیجہ یہ بھی ہے کہ اِنسان اپنے اختیار کی للکار کو سمجھ نہ سکے اور اپنے آپ کو حیوانوں میں سے ایک حیوان سمجھ بیٹھے اور حیوانوں ایسی زندگی گذارنے پر قانع ہو جائے۔ مگر حیوانوں ایسی زندگی اس کے لئے اِس لئے ممکن نہیں ہے کہ اُس کو جبلّت اور فطرت نہیں دی گئی جو اُس کی زندگی کے ہر عمل کا تعین کرتی چلی جائے

اور اس کو اُن حدود میں پابند رکھے جو اُس کی جبلت اور فطرت کا تقاضہ ہوں۔ لہٰذا وہ حیوانوں کی سطح سے بھی نیچے گر سکتا ہے ، گر جاتا ہے۔ اگر وہ اپنے اختیار کا شعور رکھے تو وہ اختیار کا غلط استعمال کر سکتا ہے۔ اس کی کئی صورتیں ممکن ہیں، وہ اس جہان کی تمام نعمتوں کو اپنی جماعت، جتھے ، قبیلے ، فرقے کے لئے محفوظ کرنے کے لئے دوسرے انسانوں کو اُن سے محروم کر دے اور اس کے لئے ایک نظام وضع کرے اور جب یہ کر لے تو اس جہان سے ماوراء فضاء کی قوتوں کو مسخر کرنے پر تل جائے، اُن قوتوں کو انسانوں کے استحصال کے لئے استعمال کرے ، اور اس جہانِ رنگ و بو کو تباہی کے کنارے تک لے جائے [اِس جہان کی تباہی اِنسان کے بس میں نہیں اگرچہ وہ اپنے غرور و تکبر میں یہ سمجھ سکتا ہے کہ وہ اِس پر قادر ہے مگر صرف خالقِ کائنات ایسا کرنے پر قادر ہے] اور انسانوں کی زندگی اجیرن کر دے اور حیات کو نعمت کی بجائے مصیبت اور عذاب سمجھنے پر مجبور کر دے اس لئے ضروری تھا کہ اُس کی ہدایت کے لئے کوئی نظام خارج سے اُسے دیا جاتا جس کی اطاعت اُسے فلاح، ارتقاء اور ارتفاع کی طرف لے جاتی اور وہ اَرض کو جنّت نشان بنا سکنے پر قادر ہو جاتا، جہاں کسی انسان کو نہ خوف ہوتا اور نہ حزن۔ لہٰذا اس کے لئے وحی کا بندوبست کیا گیا اور اُس کے اندر مضمر رکھی گئی صلاحیتوں اور امکانات پر غور کرنے اور اُن کو سمجھنے اور اُن کا علم حاصل کرنے کے لئے اُس کے اندر کے نظام میں یہ صلاحیّت رکھ دی گئی کہ اگر وہ اس نظام کا غلط استعمال کرے تو اُس کے اندر درد اور دُکھ جاگے اور اُس کی قوتِ برداشت کو آزمائے ، للکارے۔

درد اور دُکھ انسان کی اپنی ذات کی حد تک اُس کے اپنے اعمال کا نتیجہ تو ہوتے ہی ہیں مگر دوسرے انسان بھی معاشرے کی صورت میں، اُس پر دُکھ دَرد نازل کرنے کے اہل ہوتے ہیں۔ جو دُکھ دَرد معاشرے کی شکل میں انسانوں پر مسلّط ہوتے ہیں اُن کا علاج تو یہ ہے کہ معاشرے کی تشکیلِ نو وحی کی روشنی میں کر لی جائے۔ جو دُکھ دَرد اِنسان کے اپنے اعمال

کے ذریعے سے وارد ہوں اُن کے لئے لازم ہے کہ اِنسان اپنے جسمانی نظام اور اپنی عیاں اور مضمر صلاحیتوں اور قوتوں کے نظام کا علم حاصل کرے اور اپنے امکانات سے آشنا ہو جائے، اِس خود آشنائی کو نظامِ علم میں ڈھال لے، اِس علم کے مطابق اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کو مربوط اور منظم کرے تاکہ جب کبھی درد اور دُکھ للکارے تو اُس کے خلاف صف آرا ہو جائے، اُس کو رام کرلے اور اُس کو حدود میں پابند کرلے، اور اُن کی قوت اور زور کو اپنی شخصیت کی فلاح کے لئے جوت لے۔

اگر درد اور دُکھ مٹ جائے یا نہ ہو تو اِنسان کے لئے خود نگری اور خود آگاہی کے لئے کوئی تحریک اور مہمیز نہ رہے، نہ ہو، انسان محض انسان صانع بن کر رہ جائے، اِنسان بااختیار نہ بن پائے، اپنی صورت گری نہ کرسکے کیونکہ خود نگری اور خود آگاہی کے بغیر یہ ممکن نہیں ہے، اور انسان اپنے مقام اور اپنی منزل تک نہ پہنچ پائے، وہ احسن التقویم نہ بن پائے، خالق، باری و مصوّر، حکیم و حلیم، رؤف اور رحیم نہ بن پائے اور اللہ کے اسماء کو اپنی شخصیت میں بارآور نہ کر پائے۔"

شرجیل مبہوت، ہمہ تن گوش بنا، متین صاحب کی باتیں سُنتا سُنتا فکر و نظر کی فضاؤں میں اُڑتا رہا، اُڑتا اُڑتا تھک گیا تو شعور و ہوش کی فضا میں لوٹ آیا۔ اُس کو احساس ہوا کہ اب دل کی بات کہے بغیر چارہ نہیں۔ اِس سے متین صاحب کے دل پر جو گذرے گی اس کو وہ سہہ سکیں گے، اُس کا کچھ بنالیں گے۔ وہ ابھی اسی اُدھیڑ بن میں تھا کہ متین صاحب کی آواز اُس کے شعور میں اُبھری:

"دل کی بات کہتے نہ ڈر، تیری بات بجلی نہیں اور میرا دل اور ذہن آشیاں کے تنکے نہیں؟ انسان کا ذہن اور انسان کا دل ہے، جو بااختیار ہے، خالق و مصوّر ہے۔"

"اُس بات سے پہلے اِک تمہید ضروری ہے تاکہ بات کا اِک سیاق و سباق بن جائے اور میری بات اور اُس سے اُبھرنے والا سوال اِس سیاق و سباق میں پابند ہو جائے تاکہ

اُس کا صحیح صحیح تعین ہو سکے ۔

میرے ایک دوست ہیں یاسین جاوید ۔ وہ ٹینس بہت اچھی کھیلتے ہیں۔ میں ٹینس کا شوقین ہوں۔ میری اس سے دوستی ہی ٹینس کے سبب ہوئی۔ میں کالج میں کچھ ہم جماعتوں کے ساتھ ٹینس کھیل رہا تھا کہ یاسین نے دیکھ لیا اور کھیل کے بعد مجھ سے کہا کہ اُس کے ساتھ اُس کے گھر پر روز سہ پہر کے وقت ٹینس کھیلنے کو آیا کروں ۔ میں نے اُس کے چہرے پر، اُس کی آنکھوں میں بھرپور خلوص کو دیکھا اور اُس کی دعوت قبول کر لی ۔ پچھلے سات آٹھ ماہ سے مَیں ہر روز سہ پہر کو اُس کے یہاں چلا جاتا ہوں۔ ٹینس کے بعد درسی اور علمی باتیں ہوتی ہیں۔

ایک دن جو میں اُس کے یہاں پہنچا تو وہ وہاں نہیں تھا۔ اُس کے دادا ٹینس کورٹ کے قریب ایک کرسی پر بیٹھے اِنتظار کر رہے تھے۔ میں اُن کو اکثر کوٹھی کے وسیع و عریض سبزہ زاروں میں ٹہلتے دیکھا کرتا تھا اور جب کبھی رُو برو ہو جاتا تو آداب کرتا اور اُن سے دُعا لیا کرتا، جب میں وہاں پہنچا تو اُنھوں نے مجھے بتایا کہ یاسین کی پھوپھی بیمار ہے اور اُس کو بُلایا ہے۔ پھر کہا :۔

"میرے ساتھ کھیلنا پسند کرو تو میں تمہارا ساتھ دے سکتا ہوں۔ روز تمہارے آنے سے پہلے میں اور فضل دین، ہیڈ مالی، دونوں تین گیم کھیلتے ہیں۔ میں اچھا کھلاڑی ہوں۔ تمہاری گیم خراب نہیں کروں گا۔"

ہم نے تین گیمیں کھیلیں۔ اس کے بعد وہ مجھے اپنے باغ دِکھانے کے لئے لے گئے جب میں نے اُن سے رُخصت چاہی تو فرمانے لگے :۔

"تم دونوں ٹینس کے بعد چائے پیتے ہو، باتیں کرتے ہو اور پھر شام کو تم گھر جاتے ہو لہذا اِس روایت کو آج بھی برقرار رکھنا چاہیئے۔ چائے پیتے ہیں۔ باتیں بھی کریں گے۔ میں بوڑھا ضرور ہوں مگر بور نہیں ہوں۔ مَیں نے بزرگوں اور اُستادوں سے گفتگو کو بطور فن سیکھا ہے

اور فن کی پرورش کی ہے۔ اب تو فن بھی فن نہیں رہا۔ میرے بڑھاپے کو نظر انداز کر سکو تو پھر گفتگو میں آسانی رہے گی اور لطف میں خلل نہیں پڑے گا۔"

وہ مجھے گھر کے اُس حصّے میں لے گئے جہاں اُن کی رہائش تھی۔ یہ حصّہ خود کفیل تھا، اگرچہ بقیہ عمارت سے ایک مُسقّف برآمدے کے ذریعے سے منسلک تھا۔ برآمدے پر خوبصورت بیل چڑھی تھی اور بیل میں سُرخ پھول کھِل رہے تھے۔ انہوں نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور خود چلے گئے۔ تھوڑی دیر میں لوٹ آئے اور مجھے اپنے کتب خانے میں لے جا بٹھایا۔ کمرے میں کتابیں دیواروں کے ساتھ فرش سے چھت تک لگی الماریوں میں بند تھیں اور دروازوں کے شیشوں سے اپنی چھب دِکھلاتی تھیں۔ کمرے میں کھڑکیوں سے روشندانوں سے اِتنی روشنی چھَن چھَن کر آ رہی تھی کہ کتاب آسانی سے پڑھی جا سکتی تھی، مگر آنکھوں کو تنگ نہ کرتی تھی۔ اِک بڑی سی کھڑکی کے سامنے اِک میز اور اُس کے گرد کُرسیاں رکھی تھیں۔ شاید اس میز پر وہ کام کرتے تھے اور مطالعہ کرتے تھے کیونکہ میز پر لکھنے کا سامان اور کتابیں رکھی تھیں۔ کمرے کے وسط میں ایک گول میز کے گرداگرد چار کُرسیاں رکھی تھیں۔ کمرے کی مغربی دیوار میں ایک بڑی کھڑکی کے سامنے پردوں کے رُوبرو ایک آرام کرسی اور اس کے سامنے گدّے دار سٹول رکھا تھا۔ یہاں شاید وہ آرام کرتے تھے اور سردیوں میں دُھوپ سینکتے تھے۔

کمرے میں داخل ہونے کے بعد انہوں نے مجھے گول میز کے گرد ایک کرسی پر بٹھایا اور خود اُس کمرے کی مشرقی دیوار میں ایک دروازہ کھول دوسرے کمرے میں داخل ہو گئے اور وہاں سے چند لمحوں بعد ایک ٹرے میں چائے کے برتن اُٹھا لائے اور گول میز پر رکھ دیئے۔

چائے پینے کے دوران میں وہ گفتگو کرتے رہے اور بتایا کہ دوسرا کمرہ کچن ہے جہاں وہ اپنے لئے ناشتہ اور چائے بناتے ہیں، کھانا وہ اپنی بیگم کے ساتھ کھانے کے

کمرے میں کھاتے ہیں۔ جب چائے پی چکے تو برتن اُٹھا کر لے گئے تو میں نے گردوپیش پر نگاہ کی۔ الماریوں کے درمیان خالی جگہوں میں تصویریں لٹک رہی تھیں بعض تصویروں میں صرف آپ سے مشابہ نوجوان کھڑا یا بیٹھا تھا، بعض تصویروں میں ایک نوجوان عورت کہیں سبزہ زار پر، درختوں کے جھرمٹ میں سبزے پر بیٹھی تھی، کہیں سایۂ گل میں، کہیں پھل دار درختوں کے درمیان، البعض تصویروں میں وہ دونوں مرد اور عورت ساتھ ساتھ کھڑے تھے یا صوفے پر ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ لگتا تھا کہ دونوں ایک دوسرے کے لئے بنائے گئے ہیں جب وہ دوبارہ کمرے میں داخل ہوئے تو مجھے اُن کے قدموں کی چاپ سُنائی ہی نہ دی اور وہ آکر میرے پاس بیٹھ گئے، خاموش۔ کچھ دیر بعد اُن کی سانس کی لے نے اُن کی موجودگی کا احساس دِلایا۔ میں نے معذرت کی تو انہوں نے کہا:۔

"تم تصویروں کو اِس اِنہماک سے دیکھنے میں مصروف تھے کہ لگتا تھا کہ تم اُن کے ماضی اور مستقبل کے درمیاں سرگرداں ہو۔ لگتا ہے تم اُن سے آشنا بھی ہو۔"

"مجھے لگتا ہے مَرد کی تصویر پروفیسر متین کی جوانی کی تصویر ہے۔"

"کون پروفیسر متین؟"

"گورنمنٹ کالج میں فلسفے کے پروفیسر ہیں۔ ہمارے کالج کی یونین کے زیرِاہتمام انہوں نے "طب اور فلسفۂ اخلاق" پر لیکچر دیئے ہیں۔ مجھ پر بہت شفقت کرتے ہیں۔"

"جس کی یہ تصویر ہے اُس کا نام بھی متین ہی تھا مگر وہ میڈیکل کالج کا سند یافتہ تھا فلسفی نہ تھا۔ شاید تمہارا پروفیسر متین کوئی دوسرا شخص ہو۔۔۔۔ یہ دونوں بہت گہرے دوست تھے۔ میری آرزو تھی کہ دونوں نکاح کے رشتے میں بندھ جاتے۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔"

"آج کل کہاں ہیں؟"

"میں نہیں جانتا۔ میں نے پچھلے پچیس برس سے اُن کو نہیں دیکھا۔ اُن کی خیر خیریت کی بھی کوئی خبر مجھ تک نہیں پہنچی۔ تمہیں دیکھ کر یہ دونوں بہت یاد آتے ہیں، اُن کی یاد

بہت ستاتی ہے۔ کئی بار چاہا کہ تم سے بات کروں کہ دل کو سکون ملے، مگر کبھی تمہارے نوجوان ذہن پر اپنی یادوں کے حسنِ سوگوار کا عکس ڈالنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ آج اللہ نے موقعہ پیدا کر دیا ہے تو تمہیں ان کے رُو برو لے آیا ہوں۔ تمہیں چائے پلا کر، تم سے باتیں کر کے یہ احساس ہوا ہے کہ میں اُن کا میزبان ہوں، اُن کے ساتھ باتیں کر رہا ہوں۔ دل کی ڈھارس بندھی ہے، اب میں موت کی سلطنت کا سفر بے خطر کر سکنے کے قابل ہو گیا ہوں۔"

پھر وہ خاموش ہو گئے اور کمرے پر طویل خاموشی چھا گئی۔ اِک کرن نے، جو اُن کے اور میرے درمیان میز پر رقص کرنے لگی تھی، ہمیں جگا دیا۔ وہ کرسی سے اُٹھے اور آرام کرسی کے رُو برو والی کھڑکی سے پردے ہٹائے اور دھوپ کو اندر آنے کا اِذن دیا۔ آرام کرسی پر دراز ہوئے گدے دار اسٹول پر پاؤں رکھے اور مجھے مخاطب ہوئے:۔

"اس ملاقات کے لئے میں تمہارا ممنون ہوں۔ جب کبھی جی چاہے ملنے کے لئے چلے آیا کرو، بلا تکلّف۔ مجھے راحت ہوگی۔"

اِس کے بعد آنکھیں بند کر کے سو گئے اور میں وہاں سے چلا آیا۔ اُس کے بعد میں اُن سے نہیں ملا کیونکہ یاسین اُس سہ پہر کے بعد کبھی غیر حاضر نہیں ہوا اور اُس کے دادا سے ملنے کے لئے اُس کو بتانا پڑے گا کہ اُن سے کن حالات میں ملاقات ہوئی اور اُن سے دوبارہ ملاقات کا کیا جواز ہے۔ میں اُن کی ملاقات اور اُن کی گفتگو کو اِک امانت سمجھتا ہوں جس میں یاسین کو شریک کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ آپ کو شریک کرنے کا جواز ہے، جس کی وضاحت اُس سوال سے ہو گی جو میں اِس تمہید کے اختتام پر کروں گا۔ تمہید ابھی ختم نہیں ہوئی۔

اِس واقعہ کے چند دِن بعد بشیشر ناتھ کی سبکدوشی کا پتہ چلا۔ اُن کی خدمات کے پیشِ نظر اُن کے لئے الوداعی دعوت اور اِک تقریب کا اہتمام کرنے کا طلبا یونین نے فیصلہ کیا۔ میں اُن سے ملا تو انہوں نے اِس کو اِس شرط پر قبول کیا کہ اِس محفل میں آپ صدرنشین ہوں۔ میں نے اِس شرط کا سبب پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ آپ نہ صرف اُن کے محسن بلکہ اجازت

اور گرو ہیں اور یہ کہ جب کالج یونین نے آپ کے لیکچر کرائے تو وہ لیکچروں کے موضوع پر چونکے۔ لیکچرار کے نام نے اُن کی یادداشت میں اِک شمع روشن کر دی اور وہ لیکچر سننے کے لیے گئے۔ وہ آپ کو تقریر کرتے ہوئے تو پہچان نہ پائے مگر جب آپ ڈائس سے اُتر کر کالج کی روش پر اپنی کار تک گئے تو انہوں نے چال سے آپ کو پہچان لیا کہ آپ اُن کے کالج کے پرانے اور نامور طالب علم ہیں: آپ نے ایم بی بی ایس کی سند ہمارے کالج سے لی تھی اور اُس سال آپ امتحان میں اوّل آئے تھے اور وہ متین تھے جس نے اُن کو علم کی راہ پر چند منزلیں طے کرائی تھیں۔

اِس پر جب میں نے حیرانی کا اظہار کیا تو وہ مجھے لائبریری میں لے گئے۔ کالج میگزین کا سن ۱۹۱۸ء کا سالنامہ نکال لائے اور اس سال اوّل اور دوئم آنے والے لڑکے اور لڑکی کی تصویریں دکھائیں، اُن تصویروں میں وہی مرد اور عورت تھے جن کو میں یاسین جاوید کے دادا کے کُتب خانے کی دیواروں سے لٹکی ہوئی تصویروں میں دیکھ چکا تھا۔ جب میں اُن تصویروں کو دیکھ حیران ہوا تو وہ کسی یاد میں کھو گئے اور جب ہوش میں آئے تو مُسکرائے اور یوں گویا ہوئے:۔

"یہ جہان اور یہ انسان مایا کے رُوپ ہیں: نظر کچھ آتا ہے، حقیقت کچھ اور ہی ہوتی ہے۔ اِن دونوں کو لو۔ اِن دونوں میں اتنی گہری دوستی تھی کہ سب لوگ جو اُن کو جانتے تھے، سمجھتے تھے، یقین سے کہتے تھے، کہ ان دونوں کی دوستی بیاہ کا رُوپ دھارلے گی اور اُن کا مِلاپ لافانی ہوگا مگر ہوا یوں کہ نہ صرف دونوں کا بیاہ نہ ہوا بلکہ دونوں میں دوستی بھی نہ رہی اور عورت نے اپنے والدین کی مرضی کے خلاف ایک دوسرے شخص سے بیاہ کر لیا اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ بدیس چلی گئی۔ اِسی طرح متین صاحب چند ہی سال بعد مُلک چھوڑ کر چلے گئے۔ جن دنوں اُن کے لیکچر تھے تو پتہ کرنے پر معلوم ہوا کہ چند سال پہلے وہ مُلک میں لوٹ آئے تھے مگر طب کو خیرباد کہہ چکے تھے اور فلسفہ ہی اُن کا اوڑھنا بچھونا ہے۔"

"دو روز ہوئے اُن سے ملاقات ہوئی تھی، یہیں، اِسی کمرے میں۔ وہ اِنسانِ حکیم تو

ہمیشہ سے تھے۔ اب وَید بھی ہیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بیماروں کا مفت علاج کرنے کا پروگرام ہے اُن کا۔ کاش کچھ اور لوگ بھی اُن کی پیروی کریں۔"

"اِس تمہید کے بعد میرا سوال یہ ہے کہ طاہرہ محی الدّین سے آپ کی شادی کیوں نہ ہوئی۔ سر محی الدّین کو مایوس کیوں ہونا پڑا؟"

"میرے عزیز! یہ پچیس سال پُرانا واقعہ ہے۔ ماضی کو زندہ کرنا پڑے گا، ماضی میں ایک بار پھر سانس لینا ہوگا، اُس کو حاضرِ بزم کرنا ہوگا، اُس کو ایک بار پھر اپنے آپ پہ رِستانا ہوگا۔ یہ بڑے جوکھم کا سفر ہے۔ دل اور ذہن، شعور اور لاشعور کو آپس میں راضی کرنا ہوگا، پھر کہیں جاکر ماضی کی رستاخیز ممکن ہوگی۔ رستاخیز کے لئے تم جانتے ہو، حشر بپا کرنا پڑتا ہے اور جب حشر بپا کیا جائے تو جزا اور سزا کا فیصلہ بھی کرنا پڑتا ہے۔ اِس کے لئے پوری زندگی کا محاسبہ کرنا پڑتا ہے۔ یہ محاسبۂ خویش بہت کٹھن امتحان ہے جس سے اب قلب اور ذہن گریز کرتے ہیں۔ فرار چاہتے ہیں۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ سوال تمہاری زندگی کا اِک اہم سوال بن گیا ہے، جس کا جواب تمہاری مستقبل کی زندگی کو نجانے کس طرح متاثر کرے: اس سے خیر وجود میں آئے یا شر، راحت و فرحت یا دُکھ اور درد۔

بہرحال یہ سوال اُٹھایا جاچکا ہے تو اُس کا جواب تلاش کرنا ہی ہوگا۔ اِس کے لئے ماضی کو حاضرِ بزم کرنا لازم ہے۔ اِس کے لئے خوشبو اور موسیقی ہی کارگر ہوسکتے ہیں اور یادداشت میں اِس کو زندہ کرنے کے لئے وقت چاہیئے۔ لہٰذا تم ٹیلی فون پر اپنے گھر اطلاع کردو کہ آج رات تم گھر نہیں آسکو گے۔ میں خوشبو اور موسیقی کا بندوبست کرتا ہوں۔"

شرجیل نے اپنے گھر اطلاع کی اور پھر متین صاحب کے پاس لوٹ آیا۔ دونوں نے رات کا کھانا ایک ساتھ کھایا اور متین صاحب کے کتب خانے میں جا بیٹھے۔ آرام کرسیوں پر کمرے میں نہائیت بھینی بھینی خوشبو تیر رہی تھی جو تنے ہوئے جسموں کو آہستہ آہستہ دھیرے دھیرے

ڈھیلا کرنے لگی، اُن کو اِستراحت کا احساس دینے لگی۔ اِس لمحے متین صاحب نے اُٹھ کر گراموفون پر موزارٹ کے اوپرا MAGIC FLUTE کا ریکارڈ چلا دیا اور پھر آرام کرسی پر دراز ہوگئے خوشبو اور نغمے نے آہستہ آہستہ اُن کے ذہن و قلب سے ہر یاد کو جاذب کرلیا، ہر یاد محو ہوئی۔ ہر طرف گھور اندھیرا چھا گیا۔ اندھیرے نے اُس کے حواس جاذب کرلئے، وہ کہیں نہ تھا، اُس پر کچھ بیت نہ رہا تھا، وہ بے شعور تھا، بے شعور رہا، نجانے کب تلک۔ یکایک اُس نے محسوس کیا کہ اُس کے جسم پر کچھ سرسرا رہا ہے، رینگ رہا ہے۔ اس سرسراہٹ سے اُس کے اندر اِک حظ نے انگڑائی لی، دھیرے دھیرے۔ حظ جوان ہوا۔ اُس نے محسوس کیا کہ وہ سونگھ رہا ہے اِک بھینی بھینی سی لطیف خوشبو، جو اس کی دلپسند خوشبو نہ تھی بلکہ اُس سے مختلف بھی تھی اور تیز بھی۔ اِس خوشبو نے اس کے دماغ کے خُلیوں کو چھیڑنا شروع کیا، جیسے کوئی تیز دھار فولاد کا سرد نشتر۔ اُس کے خُلیے سَنَنا اُٹھے۔ اُس کا شعور جاگا۔ اُس کی چشم وا ہوئی، حیرت بنی، اِک دمکتے ریشمی سے اندھیرے کو دیکھنے لگی۔ اندھیرے میں دمکنے کی کیفیت میں اضافہ ہونے لگا، دھیرے دھیرے اندھیرا منوّر ہوا، روشنی بنا، جس کے کناروں پر اندھیرے کی جھالر اسرار جگا رہی تھی۔ روشنی میں اشیاء منوّر ہوئیں۔

اِک وادی تھی سبزہ بھری، سبزے میں پستہ قد اور دیو قامت درخت تھے، قطار اندر قطار اُفق در اُفق پھیلے ہوئے۔ قطاروں کے درمیاں سبزے پر رنگ رنگ کے باغ اور باغوں میں طرح طرح کے پھول اور پھولوں کے درمیاں سنگِ مرمر، نیلے چمکدار بلور اور سُرخ چمکیلے پتھر کی، دُور تک جاتی ہوئی روشیں اور اِن روشوں پر دوڑتے ہوئے چکور، مور، کبوتر، فاختائیں اور ان کے تعاقب میں چمکدار، نیلے، پیلے، سُرخ برنوں میں ملبوس نوجوان حسینائیں۔ یہ منظر فضا میں گرنے لگا، بہت نیچے چلا گیا، پہاڑ کی بلند چوٹی پر کمر کمر اُونچے سبزے میں اِک جنگل اور جنگل کے درختوں پر گاتے ہوئے پرندے اور جنگل کے فرش پہ شیروں کے غول کے غول محوِ خرام۔ اِس چوٹی سے پرے کئی چوٹیاں اور پھر یکایک اِن

چوٹیوں کو ملانے کے لئے سنہری سڑکیں نمودار ہوئیں اور ان سڑکوں پر جوان مردوں اور حسین عورتوں کا ازدحام رقصاں، کہیں دُور بانسری کی پُکار اور اُس کے جلو میں مختلف سازوں کی صدائیں اور پھر فضا سے پھولوں کی پتیوں کا نزول ہوا، ہوتا رہا، تا دیر۔ یہ سب کچھ مٹ گیا۔ صرف بانسری کی فریاد رہ گئی، جو کبھی لپکتی تھی، کبھی رقص کرتی تھی، کبھی فضا میں معلق ہوجاتی تھی اور کبھی اس پر چھا جاتی تھی۔ ایک بار بانسری کی یلغار بلندیوں کی طرف لپکی اور بلندیوں نے اُس کو اُچک لیا۔ کچھ نہ رہا، نہ صدا، نہ آہنگ اور نہ رنگ ریکارڈ خاموش تھا اور شرجیل آنکھیں میچے استراحت کی آغوش میں پڑا تھا۔

تمکین صاحب نے گرائیگ (GRIEG) کے گیتوں کا ایک ریکارڈ چلا دیا۔

برف زاروں کے درمیان دہکتی آگ کے گرداگرد رقص کرتی ہوئی لڑکیاں اور لڑکے، وائلن پر مستی میں گز چلاتا ہوا ایک بوڑھا جس کے نینوں میں نشہ آور انبساط اور ہلکی ہلکی شرارت، بلند پہاڑوں میں گھرے میدانوں میں بہتے ہوئے دریا، اُن دریاؤں کے کناروں پر دُور تک پھیلے ہوئے کھیت، کھیتوں میں پکی ہوئی فصلیں اور ان فصلوں کو کاٹنے میں مصروف بوڑھے، جوان، نوجوان مرد، بوڑھی، جوان، نوخیز لڑکیاں، بچیاں، منڈیروں پر خاموش بیٹھے ہوئے کُتے، فصلوں سے کٹتے ہوئے کھیت اور اُن میں رقص کرتے ہوئے بوڑھے بوڑھیاں، جوان مرد اور عورتیں اور نوجوان لڑکے لڑکیاں اور منڈیروں پر بانسریاں بجاتے ہوئے مُغنّی، شفاف آسمان، چمکیلی ہوا کے تلے سبزہ زاروں میں کھلے باغ اور اُن کی روشوں پر رقصاں نر ناریاں اور فرشتے اور باغوں کے عین وسط میں بنے چھت دار چبوتروں پر مختلف ساز بجاتے ہوئے مُغنّی، اور دُور اُفق پر چمکتے براق پہاڑ، پہاڑوں میں بہتی ندیاں، نالے، اُن پر اُڑتے ہوئے شکاری پرندے، شور مچاتے ہوئے، اُن کے کناروں پر اُگے ہوئے ہل مل کر گاتے ہوئے درخت، وسیع و عریض جھیلیں اور اُن پر تیرتی ہوئی بادبانی کشتیاں، کشتیوں سے جھیل میں چھلانگیں لگاتے ہوئے نوجوان مرد اور عورتیں، رنگین لباسوں میں ملبوس مرد

عورتیں اور بچے، گیتوں کی دھنوں پر سر دھنتے ہوئے مزے لے کر پھل اور پکا ہوا اناج کھاتے ہوئے اُن کے چہرے خوشی سے دمکتے ہوئے اِک برف سے لدی وادی میں ننھا سا شہر تاروں بھرے روشن آسمان تلے، شہر کے عین وسط میں ایک میدان، اِس میں انسانوں کا اِک ہجوم اور ہجوم کے درمیان آتش بازی چھوٹتی ہوئی، یکایک زمین سے آسمان کی طرف دائرے میں گھومتی ہوئی ایک پھلجھڑی لپکی اور فضا کے وسط میں جا کر پھٹتی ہوئی اور فضا میں روشنی کی موٹی موٹی کرنیں پھیلاتی ہوئی اور نیلی فضا کو منقش کرتی ہوئی۔ پھر یکایک اندھیرا ہوا اور کچھ نہ رہا۔

شرجیل نے آنکھ کھولی اور متین صاحب کی طرف دیکھا۔ متین صاحب آنکھیں کھولے اُس کی طرف دیکھ رہے تھے، مسکراتے ہوئے۔ اُن کی آنکھوں میں عجیب روشنی تھی جو حسین تھی مگر دل کو دہلاتی تھی۔ متین صاحب اُٹھے اور ریکارڈ بدلا اور چائیکوسکی کی SYMPHONY PATHETIQUE کا ریکارڈ رواں کر دیا۔

ایک لق و دق میدان کے مغربی اُفق پر اِک پہاڑ اور اُس کی طرف گرتا پڑتا رواں ایک مرد، جس کے لباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کبھی خوشحال ہو گا۔ وہ تیزی سے پہاڑ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ سورج مغرب کی طرف جھک رہا ہے، شام ہوا چاہتی ہے۔ مسافر کا چہرہ مغرب کی طرف ہے۔ لہٰذا کچھ نظر نہیں آتا کہ وہ کون ہے: بوڑھا ہے، جوان ہے۔ یکایک اندھیرا ہو جاتا ہے اور مسافر نظروں سے اوجھل۔ مغربی اُفق آہستہ آہستہ روشن ہونے لگتا ہے۔ پہاڑ کی چوٹی جگمگا اٹھتی ہے۔ چودھویں کا چاند مشرق سے نکل آیا ہے۔ میدان روشن ہو گیا ہے۔ مسافر دامنِ کوہ میں جا پہنچا ہے۔ وہ مُڑ کر میدان کی طرف دیکھتا ہے اور ایک لمبا سانس لیتا ہے، بیٹھ جاتا ہے، سستاتا ہے۔ وہ بہت تھک گیا ہے۔ چاند، میدان کے وسط میں آگیا ہے: ادھیڑ عمر کا یہ مرد کبھی واقعی خوبرو ہو گا، اُس کے چہرے پر تھکن کے آثار گہرے ہیں، اُس کے بالوں سے عیاں ہے کہ جب وہ

سفر پر نکلا ہوگا تو اُس نے بال سنوارے ہوں گے، مگر اب بال بکھرے ہیں۔

یکایک وہ چونکتا ہے؛ کہیں قریب ہی سے پانی میں کسی شے کے گرنے کی صدا اُٹھی ہے۔ وہ اُٹھ بیٹھتا ہے، کھڑا ہو جاتا ہے اور آواز کی سمت روانہ ہو جاتا ہے۔ دامنِ کوہ کے جنوب کی طرف چلا جا رہا ہے۔ آہستہ آہستہ سبزہ نظر آنے لگتا ہے، درخت نظر آتے ہیں، درختوں کے جھرمٹ قطار اندر قطار، درخت پھل دار بھی ہیں اور بغیر پھل کے بھی۔ اِن درختوں کی قطاروں سے پرے درختوں کے درمیان درزوں میں سے چمکدار پانی نظر آ رہا ہے۔ وہ پانی کی اُور بڑھتا ہے، بڑھتا چلا جاتا ہے۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی ہے۔ اُس کی چال سے عیاں ہے کہ اُس کی تھکن پر تازگی کا غلبہ بڑھ رہا ہے۔

اور وہ پانی کے قریب پہنچ گیا ہے۔ یہ پانی ایک جھیل کا ہے، جھیل میں کوئی تیر رہا ہے۔ ایک عورت تیر رہی ہے۔ وہ عورت کنارے کی طرف بڑھ رہی ہے، مرد درختوں کی اوٹ میں چھپ جاتا ہے۔ عورت کنارے پر پہنچ کر اِدھر اُدھر دیکھتی ہے اور پانی سے نکل آتی ہے۔ اُس کے بے لباس جسم پر پانی کے قطرے بہت بھلے لگتے ہیں۔ سبزہ زار پر پڑے ہوئے کپڑوں کو ایک ایک کر کے اُٹھاتی ہے اور پہنتی چلی جاتی ہے۔ وہ چلنے کو تیار ہے، چل پڑی ہے۔ وہ چلتے چلتے اُس درخت کے پاس پہنچ جاتی ہے جہاں مرد چھپا کھڑا ہے۔ درخت سے اِک پھل مرد کے شانے پر گرتا ہے۔ وہ چونکتا ہے اور اُس کے مُنہ سے خوف کی صدا اُبھرتی ہے۔ عورت اُس کے بالکل قریب آ چکی ہے اور وہ دونوں رُو برو ہیں۔ دونوں جھیل کے کنارے ہاتھوں میں ہاتھ دیئے چلے جا رہے ہیں، چاند مخالف سمت میں ہے۔ یکایک وہ رُک جاتے ہیں۔ اُن کے سامنے جھیل کی سطح پر کنول کے پھول کھلے ہیں، بے شمار۔ مرد جھک کر ساحل کے قریب سے کنول کا پھول توڑ عورت کو پیش کرتا ہے۔ اِتنے میں کہیں دُور سے بانسری کی پکار سنائی دیتی ہے۔ وہ دونوں ٹھٹک جاتے ہیں۔ بانسری کی صدا فضا میں رقص کرتی ہوئی بڑھتی چلی آ رہی ہے۔ بانسری کی صدا

رُک جاتی ہے۔ وہ دونوں حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔

منظر بدلتا ہے۔ ایک سبزہ زار میں اِک گلزار کھلا ہے۔ ہلکی ہلکی ہَوا چل رہی ہے۔ تمام گلاب کے پھُول پتی پتی کر کے فرشِ گلزار پر گرتے ہیں۔ صرف اِک شاخِ بلند پر اِک گلاب کا پھول رہ گیا ہے۔ تیز ہوا چلتی ہے۔ گلاب کا تنہا پھول ہوا میں لچکتا ہے، لہراتا ہے۔ اِس گلاب کے پھول کے سایے میں کچھ کتابیں فرش پر بکھری ہیں۔ اِک کتاب کھُلی ہے۔ پاس ہی اِک حسین لڑکی کچھ ڈھونڈ رہی ہے۔ ایک آواز فضا میں اُبھرتی ہے:۔

"بہار تو جا چکی۔ اب صحنِ گلزار میں کیا تلاش کیا جا رہا ہے۔ اب تو اگلے سال ہی بہار آئے گی۔"

" اوہ، یُو سِلی۔ اس کا بہار سے کیا تعلق ہے۔ (پھر چونک کر) تم ہو متین!

ریکارڈ اختتام پر پہنچ گیا۔ کمرے میں بالکل خاموشی تھی۔ شرجیل سو رہا تھا۔ اُس کے چہرے سے لگتا تھا کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے، جو اُس کو اُلجھا رہا ہے، رِجھا رہا ہے۔ اُس نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں۔ اُس کے چہرے پر حیرانی کے آثار تھے۔ وہ اجنبی ماحول پر حیران تھا۔ وہ ماحول کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ بالآخر اُس نے ماحول کو پہچان لیا۔ اُس نے متین صاحب کی طرف دیکھا۔ اُن کی آنکھیں تو کھُلی تھیں مگر کہیں پر بھی اُن کی نظر مرکوز نہ تھی، وہ ابھی تک کسی منظر میں کھوئے ہوئے تھے جو ان کی آنکھوں میں جم رہا تھا۔ اِک طویل لمحے کے بعد وہ اپنے گرد و پیش میں لوٹ آئے۔ اُن کی نظریں شرجیل پر مرکوز ہوئیں۔ اُن آنکھوں میں خوشی تھی، سُرخوشی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ ان کی آنکھوں میں کئی منظر ابھر رہے ہوں اور ان مناظر کے اُبھرنے پر اُن کو کوئی اختیار نہ ہو۔

۲

میڈیکل کالج میں طاہرہ محی الدین سب کی منظورِ نظر تھی مگر اس کے باوجود سب

اس سے دبتے تھے، وہ نہ صرف حسین و ذہین تھی، خود کار چلا کر کالج عین وقت پر پہنچتی، کالج سے فارغ ہوتے ہی کار میں بیٹھ کالج سے رخصت ہو جاتی جب کبھی کالج میں کوئی محفل کوئی تقریب ہوتی تو وہاں مقررہ وقت پہ پہنچتی اور محفل و تقریب کے برخاست ہوتے ہی رخصت ہو جاتی اپنی جماعت کی ہفتہ وار محفل میں اگر کسی موضوع پر تبادلۂ خیال کے دوران کسی نے اس کے خیال کو رَد کرنے کے لئے دلیل کی بجائے ظرافت یا طنز کا استعمال کیا تو وہ اُس کا جواب ایسا غیر ذاتی طنزیہ فقرہ استعمال کر کے دیتی کہ طنز کرنے والا نہ صرف حیران رہ جاتا بلکہ زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑا کر رہ جاتا اور پھر کبھی اُس کے مُنہ نہ آتا، وہ اپنی حدود میں رہتی تھی، لہٰذا اُس کے اُستادوں، ہم جماعتوں، کالج کے ملازموں کو سختی سے اپنی حدود میں پابند رہنا پڑتا؛ اگر کسی نے حدود فراموش کرنے کی کوشش کی تو اُس کی ہر دم نیم وا رہنے والی آنکھیں پوری کی پوری کھُل جاتیں اور اُن سے طنز کی تیز شعاعیں نکلتی محسوس ہوتیں، جو گستاخ کو حدود میں ہمیشہ کے لئے مسدود کر دیتیں، وہ کالج کی لائبریری میں بھی کبھی نہ جاتی تھی کہ اُس کو جس کتاب کی ضرورت ہوتی، بازار سے خرید لیتی، بازار سے دستیاب نہ ہوتی تو ناشر سے منگوا لیتی تھی، وہ خود مکتفی ہونے کے باوجود نہ مغرور تھی اور نہ بد دماغ — وہ کالج کے مسکین ملازموں سے بہت شفقت سے پیش آتی تھی اور حاجت مند کی مدد نہایت سلیقے اور ادب سے کرتی، خود داری کو ٹھیس لگائے بغیر۔

کالج کی لڑکیوں سے بھی اُس کے تعلقات ٹِبے رسمی سے تھے، اگرچہ وہ اُن کے اجتماعی مفادات کے تحفّظ کے لئے اُن کی ہر کاروائی میں شرکت کرتی، مگر وہ کسی کو اپنے گھر مدعو کرتی اور نہ کسی کے گھر جاتی تھی اور نہ کسی کو اپنی کار میں لفٹ دیتی تھی۔ کالج کی تعلیم کے دوران میں صرف ایک بار کالج کے شریف اور مسکین ترین ملازم کو اپنی کار میں نہ صرف لفٹ دی بلکہ شہر سے دُور ایک کونے میں اُس کے گھر چھوڑنے گئی، لیکن اُس کی وجہ ملازم کی اپنی ذات نہ تھی بلکہ اُس کی ننھی بہن تھی جس کو کالج کے مشہور ماہر معالج سے وہ

معائنہ کرانے کے لئے لے کر آیا تھا۔ اور معائنہ کرانے کے بعد سواری کا منتظر تھا مگر کوئی تانگے والا اُس دُور دراز آبادی کی طرف جانے کے لئے تیار نہ تھا یا بہت زیادہ کرایہ مانگتا تھا، جس کی اُس میں سکت نہ تھی۔ کچھ ملازمین نے اِس منظر کو دیکھا: طاہرہ اپنی کار کا دروازہ کھولے کھڑی اُس کو کہہ رہی ہے کہ وہ اپنی بہن کو لے کر اُس کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ جائے تاکہ وہ دونوں کو گھر چھوڑ آئے، ملازم حیرت سے اُس کو دیکھتا ہے اور اس کے اصرار پر اس کو کچھ کہتا ہے اور وہ اُس کو کار کی پچھلی سیٹ پر اور اُس کی بہن کو اگلی سیٹ پر بٹھا، کار کے دروازے بند کر، تو وڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ روانہ ہو جاتی ہے۔

طاہرہ کا سرو قد، سنہرے بال، فراخ روشن پیشانی، بڑی بڑی ہر دم نیم وا رہنے والی آنکھیں، دن کے مختلف اوقات میں مختلف رنگ بدلتی پتلیاں، چُست اور چاک و چوبند جسم، متناسب اور مضبوط بازو، اور اُس کے والد اور اُس کے خاندان کی داستانی دولت اور زرعی اراضیات اور شہری جائیداد، اور اُس سے وجود میں آنے والا اثر و رسوخ اُس کے اُستادوں، ہم جماعتوں، کالج کے ملازموں، کو متوجہ کرتا تھا اور مرعوب بھی مگر مردم شناس نظروں کے لئے وہ ایک تنہا اور اکیلی لڑکی تھی جو نہ جانتی تھی کہ زندگی کے سفر میں یہ سب کچھ جو اُس کو مُیسر تھا اور اُس کے حوالے سے جو آسائشیں اور عیش اُس کو مُیسر آسکتے تھے، وہ سب کچھ ناکافی تھے، کیونکہ زندگی کا سفر اِک صحیح ساتھی کے بغیر عذاب ہوتا ہے اور اُس جیسی لڑکی کے لئے صحیح ساتھی ملنا اُس کے معاشرے میں محال تھا۔ اُس کا اپنا خیال تھا کہ جیسے وہ اپنے ذوق و شوق کی ہر تسکین حاصل کر لیتی تھی اِسی طرح وہ زندگی کا ساتھی بھی حاصل کر لے گی۔

تعلیم کے دَوران میں، اسکول اور میڈیکل کالج میں، متین خاموش طبع اور نہایت محنتی لڑکا تھا جس کا لائبریری سے ہمیشہ گہرا رابطہ اور لگاؤ رہا۔ وہ ایسا لباس پہننے کا

عادی تھا جس میں سادگی اور نفاست بیک وقت موجود ہوتی۔ اُس کو جو جیب خرچ ملتا اُس سے وہ صرف غیر درسی کتب یا اپنی من پسند خوشبو خریدتا تھا۔ شہر کے کتب فروشوں کے لئے وہ اِک جانی پہچانی شخصیت تھا۔

طاہرہ اور متین ایک دوسرے کو کالج کے علاوہ کتابوں کی دُکانوں میں داخل ہوتے ہوئے یا نکلتے ہوئے دیکھتے تھے مگر دیکھ کر کنی کاٹ جاتے۔ ایک دوسرے کی پسند کی کتاب کبھی طاہرہ اور کبھی متین شہر کی کسی کتابوں کی دکان سے پہلے خرید کر لے جاتا۔ (ایسی کتابیں عام پسند کی نہ ہوتیں تھیں' لہٰذا ایک آدھ جلد ہی کسی ایک دکان پر آتی تھی۔) جب ایسا ہوتا تو دوسرے کو پتہ چل جاتا۔ یوں دونوں میں ایک دوسرے کے لئے کشش کا سامان پیدا ہوتا رہتا مگر دونوں میں سے کسی نے اِس کا اظہار کرنے کی کوشش نہ کی۔

ایک دن طاہرہ کالج سے فارغ ہو' درسی کتابیں اُٹھائے' تیز تیز' نپے تُلے قدم اُٹھاتی ہوئی اپنی کار کی طرف چلی جا رہی تھی کہ وہ کالج کے سبزہ زار میں بنائے ہوئے گلزار کے قریب پہنچی تو بہار کا آخری گلاب کا پھول تیز ہوا میں اِس اَدا سے لچکا اور جھول گیا کہ طاہرہ کی نظریں بے اختیار اس کی طرف اس طرح متوجہ ہوئیں کہ وہ اپنے ماحول سے' اپنے آپ سے' لمحے بھر کے لئے' بے خبر ہو گئی اور اُس کا ایک پاؤں پتھریلی روش کے ایک ننھے سے غیر متوازن حصے پر پڑا' وہ لڑکھڑائی اور اُس کے ہاتھ سے کتابیں اُچھل کر صحنِ گلزار میں جا گریں۔ اِس پر وہ بہت حیران ہوئی۔ حادثہ یقیناً غیر متوقع تھا کہ وہ اِس روش سے روز گزرتی تھی اور کبھی حادثہ نہ ہوا تھا۔ گلزار میں اُس کی کتابیں بکھر گئیں' ایک کتاب کُھل گئی اور اس میں رکھا ہوا خط نکل کر گلزار میں کہیں غائب ہو گیا۔ جب وہ ہوش میں آئی تو وہ جُھکی کہ کتابوں کو اِکٹھا کرے۔ کُھلی کتاب کو دیکھ کر اُس کو یاد آیا کہ اِس میں اُس نے ایک خط رکھا تھا جو گھر سے کالج آتے ہوئے اُس کو ملا تھا۔ وہ

خط تلاش کرنے لگی۔ اِسی دَوران میں متین لائبریری سے نکل، کتابیں اُٹھائے، گلزار کے قریب اُس روش پر آنکلا۔ اُس نے دیکھا صحن گلزار میں کتابیں بکھری پڑی ہیں.... اور طاہرہ گلزار میں کچھ ڈھونڈتی پھرتی ہے۔ وہ رُک گیا۔ جب اُس نے دیکھا کہ طاہرہ تلاش میں مگن اور پریشان ہے تو اُس نے پُکارا :-

"بہار تو جاچکی، اب صحن گلزار میں کیا تلاش کیا جارہا ہے۔ اب تو اگلے سال ہی بہار آئے گی۔"

"Oh, you silly - اِس کا بہار سے کوئی تعلق نہیں۔ (پھر چونک کر) تم ہو، متین ؟ چلی آرہی تھی کہ پاؤں غیر ہموار سطح پر لڑکھڑا گئے، کتابیں گر گئیں، بکھر گئیں۔ ان میں ایک خط تھا، جو کتاب سے نکل کہیں جا گرا ہے۔ مل نہیں رہا۔"

"کِس کتاب میں تھا؟"

"یہ جو کھُلی پڑی ہے۔"

"یہ اُسی طرح پڑی ہے جس طرح گری تھی۔"

"میں نے کسی کتاب کو چھیڑا ہی نہیں کہ مجھے یاد آگیا کہ اِسی کتاب میں خط تھا اور تلاش میں لگ گئی۔"

متین نے کھُلی کتاب کی سیدھ میں اُس پار دیکھا جو پتھریلی روش کے مقابل تھا۔ اُس کے مقابل باڑ تھی جو گلزار کو سبزہ زار سے الگ کرتی تھی۔ وہ اُس کے قریب گیا اور جُھک کر آہستہ آہستہ چپہ چپہ دیکھا۔ ایک جگہ گھنی باڑ کے عین تلے باڑ کے آخری کونے میں اُلجھا ہوا ایک دبیز جلد کا سفید بُراق سا لفافہ نظر آیا۔

"مل گیا! اِدھر آئیے۔"

"جب طاہرہ قریب گئی تو اس نے اشارے سے بتایا کہ یہ رہا تمھارا خط۔

"خط ہے سانپ تو نہیں کہ تم چھُونے کو، پکڑنے کو تیار نہیں ہو۔ لوئیں پکڑے لیتی ہوں

مجھے تو کچھ نہیں ہوا۔"

"چونکہ یہ تمہارا خط ہے لہٰذا میرا اُس کو چھُونا دخل در معقولات ہوتا۔ اِس لئے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ تم خود اِس کو باڑ کی گرفت سے آزاد کرو۔"

"YOU ARE TOO PROPER ۔ ایسی بھی پابندئی رسوم کیا!"

"یہ رسم کی نہیں حق کی بات ہے۔کسی کے خط کو چھُونا حد سے تجاوز کرنا ہے کہ خط کے متن سے آگاہ ہونے کی خواہش کو عیاں کرتا ہے' اِس خواہش کا کسی دوسرے کو حق نہیں پہنچتا .... اب تمہارا خط تمہیں مل گیا ہے اِس لئے مجھے اجازت؟"

"اب جب کہ ہم دونوں کی' کلاس سے باہر' ارادے کے بغیر ملاقات ہو ہی گئی ہے تو کچھ دیر میرے ساتھ چل لو گے تو یہ دخل در معقولات نہیں ہوگا۔"

طاہرہ نے جھُک کر کتابیں اُٹھالیں اور دونوں گلزار سے نکل پتھریلے فرش پر چل نکلے۔متین نے دیکھا کہ طاہرہ کا بایاں پاؤں دائیں پاؤں کے اُٹھانے میں برابر کا شریک نہیں ہے۔اُس نے اندازہ کیا بائیں پاؤں میں ہلکی سی موچ آگئی ہے جس کا اگر فوری علاج نہ کیا گیا تو موچ کی نوعیت شدید ہو سکتی ہے۔لہٰذا اُس نے طاہرہ سے کہا:۔

"بایاں پاؤں تمہارا بوجھ اُٹھانے سے گریز کرتا نظر آتا ہے۔شاید موچ آگئی ہے۔اس کا فوری علاج ضروری ہے۔اگر گھر میں سلاجیت ہو تو ذرا سی گرم گرم دودھ میں ڈال کر پی لینا۔خون جمے گا نہیں۔اور موچ سے پاؤں سوجے گا نہیں۔اگر نہ ہو تو پھر پاؤں پر گرم جرابیں پہن' بوٹ چڑھا' اپنے گھر میں میل دو میل چل لینا' خون کی گردش پاؤں میں بحال ہو جائے گی۔"

"گھر میں تو بالکل نہیں ہوگی۔ہمارے ہیڈ مالی کے یہاں ہونے کا قوی امکان ہے کہ وہ اپنے گھر والوں کی چھوٹی موٹی تکلیف کا خود ہی علاج کر لیتا ہے۔ڈاکٹر حکیم کے پاس جانے سے گریز کرتا ہے۔"

"اپنی کتابیں مجھے دے دو ورنہ پھر پاؤں ڈول جائے گا اور موچ میں شدت آجائے گی۔"

طاہرہ نے اپنی کتابیں اُن کتابوں کے ساتھ رکھ دیں جن کو وہ اپنے سینے کے ساتھ دائیں بازو کے سہارے لگائے چل رہا تھا۔

"ہم دونوں کو آج سے بہت پہلے کلاس روم سے باہر مل لینا چاہیئے تھا۔ شاید یہ حادثہ نہ ہوتا۔ میں تو تم سے ملنا چاہتی تھی مگر تمہارے رویّے کو میں نے ہمیشہ بہت ہی رُکھی پایا، جس میں بے اعتنائی اور گریز نمایاں نظر آیا۔"

"میں نے ہمیشہ محسوس کیا کہ تمہارے پاس وقت کی کمی ہے اور کالج سے فارغ ہوتے ہی گھر جانے کی جلدی، جیسے رُک جانے سے تمہیں خوف آتا ہو...... اور حسین اور بہت امیر لڑکیوں سے مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"کیوں؟ وہ اِنسان نہیں ہوتیں؟"

"عام اِنسانوں سے بہت ہی مختلف۔ اُن کا جہاں، اُن کا ماحول، بہت مختلف ہوتا ہے؛ اُن کے محسوسات، جذبات اور اُن کے رویّے بہت ہی مختلف ہوتے ہیں۔ اِسی لئے تو تم سے سب دبتے ہیں، مرعوب ہیں۔"

"میں نے تو اپنے آپ کو عام انسانوں سے، اُستادوں سے، ہم جماعتوں سے، مختلف محسوس نہیں کیا۔ عام اِنسانوں کی طرح میرے پاؤں میں بھی موچ آجاتی ہے جس کا علاج سلاجیت ہی سے ہو جاتا ہے۔"

"جب تک تم عام اِنسانوں کے قریب نہ آؤ اُس وقت تک تمہیں کیسے محسوس ہو کہ وہ کیا محسوس کرتے ہیں، کیسے محسوس کرتے ہیں، کیا سوچتے ہیں، چیزوں کو، لوگوں کو، مظاہرِ فطرت کس طرح دیکھتے ہیں۔"

"یہ ٹھیک ہے کہ مجھے دوسروں کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اپنی حاجتوں کو پورا کرنے کے لئے کبھی سوچنا نہیں پڑا، آرزو نہیں کرنا پڑی، کوشش نہیں کرنا پڑی، لیکن میں ادب کی قاری، مصوری کی ناظر، موسیقی کی سامع، ہوں، اُن کے مطالعے اور اُن کے

قرب نے مجھے ہمیشہ احساس دِلایا ہے کہ میں عام انسانوں کی طرح انسان ہوں، چاہے یہ انسان ہومر کے رزمیے کے ہوں یا گوئٹے اور بالزاک کے، مسکیجیو، لیونارڈو ڈِی، ٹِشئین، الگریکو، فلیمش مصوروں، فان گوگ کی تصویروں کے انسان۔ موسیقی مجھے متاثر کرتی ہے، بے قرار کرتی ہے، وجد میں لے آتی ہے....

میں اگر امیر گھرانے میں پیدا ہوگئی اور اللہ نے مجھے حسن عطا کر دیا تو میں انسانوں کے زُمرے میں سے نکل تو نہیں گئی: انسان ہوں، اِنسان رہوں گی۔ انسان ایک محدود مگر وسیع دائرے میں بااختیار بنایا گیا ہے۔ اگر میں اپنے اختیار کو اپنی زندگی کا تعین کرنے کے لئے استعمال کرتی ہوں تو میں انسانوں سے الگ تو نہیں ہو جاتی۔ غریبوں کی طرح مجبور و مقہور ہونا انسانیت کی دلیل کیوں قرار پائے۔ میں انسانوں کو مجبور و مقہور دیکھنا پسند نہیں کرتی۔ اِس کےلئے اگر معاشرے میں تبدیلیاں لانا لازم ہیں، چاہے وہ کتنی ہی بنیادی ہی کیوں نہ ہوں، تو معاشرے کی تشکیلِ نو کر لینی چاہیئے۔ مگر اُس وقت تک جو سہولتیں مجھے میسر ہیں، جو اختیار مجھے مِلا ہے، اِس کو استعمال کرنے کا مجھے حق ہے اور اس اختیار کو استعمال کرنے سے نہ تو اِنسانوں کے درجے سے بلند ہو جاتی ہوں اور نہ اُس سے گر جاتی ہوں۔

تم بھی کم ہی لوگوں سے مِلتے ہو۔ میں نے کالج کے باہر جب بھی تمہیں دیکھا ہے تنہا ہی دیکھا ہے۔ تمہارے واقف تو خاصے ہوں گے مگر دوست شاید ایک انگلی کے پوروں پر گِنے جاسکیں۔ میں تو تمہارے کسی دوست سے واقف نہیں ہوں۔ میرے علم کے مطابق نہ تو تم غریب ہو، نہ مجبور و مقہور۔ تم بھی اپنی زندگی کے مراحل اور کیفیات کا تعین خود کرتے ہو۔ تمہارے لباس کی نفاست بھری سادگی اور وہ خوشبو جو تم استعمال کرتے ہو اس بات کا ثبوت ہے کہ تمہارا ہر عمل سُوجھ بُوجھ سے پھوٹتا ہے، پروان چڑھتا ہے۔"

"میرے بارے میں تمہاری اطلاعات صحیح ہیں۔ تم نے میرے بارے میں تجسس کیا، اِس سے ثابت ہوا کہ تم بھی اِنسان ہی ہو، مگر پھر بھی میں یہی کہوں گا تم عام انسانوں سے

بہت مختلف ہو ، اگر یکسر مختلف نہیں ہو، میں یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ میں بھی عام انسانوں سے مختلف ہوں ۔ مجھے اس سے بھی انکار نہیں ہے میں اپنی زندگی کا تعین سوچ بچار کے بعد خود کرتا ہوں ۔ یہ اس لئے کہ میں حوادث کا شکار ہونا پسند نہیں کرتا ۔ جو اختیار اللہ نے مجھے دیا ہے اُس کا بھرپور استعمال نہ کرنا ناشکری سمجھتا ہوں ۔"

"ہم دونوں میں بہت کچھ مشترک ہے ۔ اس لئے ہمارے ملتے رہنے کا کافی جواز ہے اور ہم دونوں ایک دوسرے میں کشش بھی محسوس کرتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔

"مجھے اجازت ہے ؟"

"کیوں ؟"

"تم مجھے بے نقاب کرنے پر تلی ہو اور میں بے حجاب ہونے کے لئے تیار نہیں اور نہ مجھے پسند ہے ۔"

"پھر وعدہ کرو ملتے رہنے کا ۔"

"وعدہ ہے ۔"

اُس دن کے بعد وہ ہر روز ملتے ۔ طاہرہ نے معمول بنالیا کہ کار کے فٹ بورڈ پر ایک پاؤں رکھے، دروازہ کھولے ، ہاتھ میں کتابیں اُٹھائے، کھڑی ہے اور متین سے دس ، پندرہ منٹ ، کبھی آدھ گھنٹہ بھر باتیں کئے چلی جارہی ہے ۔ ایسے سمے متین کو محسوس ہوتا کہ جن باتوں کے کرنے کی خواہش کو اُس نے لاشعوری طور پر دبا رکھا تھا وہ اُسی خواہش کو جلد از جلد حصول میں بدل لینا چاہتی ہے ۔ اُس کی باتوں میں حسن ہوتا ، بالعموم سطحی ، مگر کبھی کبھی ان میں بڑی گہرائی بھی ہوتی ، ایک دو دفعہ اُس کی گفتگو کے حسن میں گیرائی بھی محسوس ہوئی ۔

اُس نے ہمیشہ محسوس کیا کہ طاہرہ اُس کا زوج نہیں اگرچہ اُس سے اک محدود عرصہ تک دوستی چل سکتی ہے ۔ لہٰذا وہ اِس دوستی کو اُس لمحے تک نبھانا چاہتا تھا جب تک

جدائی کا ناگزیر لمحہ نہ آجائے۔

اُس کو کئی بار خیال آتا کہ طاہرہ لوگوں کو چڑانے کے لئے اُس سے کالج کے اوقات میں طویل گفتگوئیں کرتی ہے مگر یہ بات اِس کی تردید کرتی کہ طاہرہ اکثر اِصرار کرکے اُس کو اپنے گھر لے جایا کرتی، وہاں اُس کی بہت خاطر مدارات کرتی، اُس کے ناز اُٹھاتی، اُس کے بڑے بھائی، اس کی بڑی بہنیں، اُس کے والدین، اُس کے گھریلو ملازمین، اُس کے جدی پُشتی نوکر، اُس کا بہت احترام کرتے، کبھی کبھی اُس کو بڑا واضح احساس دلاتے کہ وہ اُن کا منظورِ نظر ہے، اُس کے والدین کا اُس سے اِختصاصی طرزِ عمل کا خلوص اِس کو بتاتا کہ اُس سے اُن کو ایسی حرارت ملتی ہے کہ اُن کے جسم وجان میں استراحت کا اور اُن کے چہروں پر فرحت کا گُلال کِھلتا ہے۔ اِس پیار اور لگاؤ میں اُس کو ہمیشہ گہرائی کا 'گیرائی کا' احساس ہوتا۔ اِس پیار، لگاؤ اور اِحترام سے اُس کو اکثر اِک انجانا سا خوف اپنے دل و دماغ میں رچتا ہوا محسوس ہوتا، جیسے کہ وہ طاہرہ کے لئے ٹرکش باتھ بن گیا ہے جو اُس کو مزا اور فرحت اور اِستراحت دیتا ہے۔ یہ اُس کو اپنی ذات کا اِنکار معلوم ہوتا کیونکہ وہ ذریعہ بن گیا تھا اور مقصود بالذات نہ رہا تھا۔

وہ اُن کے گھر کا اِک معزز فرد بن گیا جس کی پسند اور ناپسند کا اُس گھر میں خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ اُس نے محسوس کرنا شروع کیا کہ جیسے اُس کے گرد اگرد حِصار کھینچا جارہا ہو، اُس کو پابند کیا جارہا ہو، اُس کو پیار سے، دُلار سے، لاچار اور بے بس کیا جارہا ہو۔ اِس کے باوجود اس کو یہ پیار، یہ دُلار، بھلا لگتا، اچھا لگتا، مگر درست نہ لگتا۔ اُس کا جی چاہتا کہ وہ کہیں غائب ہو جائے۔

کبھی کبھی اُس کو لگتا کہ طاہرہ اُس کو لبھانے، رِجھانے، للچانے کی کوشش کرتی ہے۔ مگر وہ کبھی اپنے تئیں کسی ایسے عمل کی نشان دہی نہ کر پاتا۔ اُس کا ایسا کرنا اُس کو کئی سطحوں پر لُطف دیتا۔ کبھی اُس کو محسوس ہوتا کہ اُس کی آنکھوں کی پُتلیوں کا دن رات

میں کئی بار بدلتا ہوا رنگ اُس کے جسم و جان میں رچنے لگا ہے، رچ گیا ہے۔ کبھی اُس کے اندر بڑی تیز اور گہری خواہش پھوٹ بہتی، کہ وہ طاہرہ کے جسم کے کسی اَنگ کو اُس تنہائی کے دوران میں جو اُس کو اور طاہرہ کو اکثر میسّر رہتی، چھُوئے، مگر اِک خوف اُس کو اِس سے باز رکھتا۔۔۔ اگر اُس نے اس کو چھُو لیا تو پھر ایسا اکثر کرتے رہنا اُس کی اِک مسلسل حاجت بن جائے گا، وہ بے بس ہو جائے گا، اِک شدید حظ اور مزے میں محبوس ہو جائے گا، اور اِس بندی خانے سے اُس کی رہائی ممکن نہ ہو گی۔ اُس کے حواس، اُس کا ذہن، اُس کا تخیّل، اُس کا دل، اُس کو بندی خانے کا مکین بن جانے پر راضی کرتے مگر اس کی روح اس بندی خانے میں قید ہونے پر کبھی راضی نہ ہوتی۔ اُس کو کہیں اپنے اندر یہ واضح طور پر معلوم تھا کہ طاہرہ کی اُس کے لئے کشش اور اُس کی طاہرہ کیلئے جاذبیت جسم اور جنس تک محدود نہ تھی کیونکہ اس کشش میں دونوں کے ذہنی رُجحانات، اُن کا قلبی میلان، ان کے تخیّل کی صوری صلاحیتیں، اِک نیا جہاں بنا لینے پر مُصر اور قادر تھیں، مگر اس کو اِک عمیق سطح پر یہ معلوم تھا اگرچہ دونوں مل کر اِک جہاں تو خلق کرلیں گے، مگر پھر تمام عمر اُس میں محدود و مسدود اور محسور ہو جائیں، اِس سے نکل نہ پائیں گے، اُن کا اُنفسی اِرتقا رُک جائے گا، یہ حسین جہاں اُن پر تنگ ہو جائے گا، جہنم بن جائے گا، وہ ایک دوسرے کو مطعون کرتے رہیں گے: "یہ جہنم تمہارا لایا ہوا ہے"؛ اُن کی محبّت نفرت اور دشمنی میں بدل جائے گی، مگر دونوں ساتھ رہنے پر مجبور ہوں گے۔ کیونکہ جُدائی بھی اُن کے لئے اِک نیا دوزخ وضع کر دے گی۔ اِس خوف نے اُس کو طاہرہ کو چھُونے سے باز رکھا اور اُس نے کوشش کی کہ تنہائی میسّر آنے کے باوجود دونوں میں اِک حجاب رہے۔ طاہرہ نے محسوس کیا کہ وہ حجاب کرتا ہے، رکھتا ہے؛ اُس نے اِس حجاب کو چاک کرنے کے لئے اُس کے دل میں حسد کو جگانا مناسب جانا۔ اُس نے اپنے اِک دُور کے رشتہ دار کو مُنہ لگانا شروع کر دیا جو ایک عرصے سے اُس کے قریب آنے

کے لئے جتن کر رہا تھا اور اُس کو بہت خوبصورت خط لکھتا رہتا تھا۔ طاہرہ متین کو اپنے کلب، کسی اعلیٰ ہوٹل کے ریستوران میں، کسی سینما میں لے جاتی، جہاں اُن کی ملاقات اچانک نادر علی خاں سے ہو جاتی۔ جب وہ پہلی بار طاہرہ اور اُس سے اچانک ملا (ظاہر یہی کیا گیا، مگر ملاقات اچانک نہ تھی، طاہرہ اور نادر کے منصوبے سے طے پائی تھی) تو طاہرہ نے نادر سے اُس کا یہ کہہ کر تعارف کرایا :۔

"متین، یہ نادر علی خاں ہیں۔ میرے کزن ہیں اور اِن کی زرعی اراضی ہماری زرعی اراضی کے ساتھ لگتی ہے۔ یہ بہت دلچسپ گفتگو کرتے ہیں اور جب شہر آتے ہیں تو صرف محفل آرائی کرتے ہیں۔

"نادر، یہ متین ہیں، میرے بہت ہی عزیز دوست اور میڈیکل کالج میں میرے ہم جماعت، ہمارے گھر میں سبھی کے منظورِ نظر ہیں، ابا امی تو اُن کو دیکھ کر جیتے ہیں۔"

نادر علی خاں جب بھی طاہرہ کے گھر آتا تو صرف طاہرہ کے والد اُس سے غیر رسمی طور پر ملتے، باقی سب گھر والے اُس سے رسمی ملاقات کرتے۔ طاہرہ گھر پر اُس سے ملنے سے گریز کرتی: نادر علی اُس کے گھر اُسی وقت جاتا جب وہ گھر پر نہ ہوتی۔ یہ بھی دونوں کا منصوبہ ہوتا۔ جب کبھی متین اُن کے گھر نادر علی کی موجودگی میں چلا جاتا تو طاہرہ کے بڑے بھائی اس کو بتاتے کہ اُن کے گھر میں کوئی نادر کو پسند نہیں کرتا مگر ابا اُس سے اس لئے مل لیتے ہیں کہ وہ اُن کی جاگیر کے اضلاع کا سب سے بااثر سیاست باز تھا اور انگریز افسروں کا منظورِ نظر تھا، وہ اپنے رقیبوں کو نیچا دکھانے کے لئے اُن کے نوجوان لڑکوں کو شراب اور عورت سے آشنا کرانے کا انتظام اس خوبی سے کرتا کہ اُس پر حرف نہ آئے اور یہ نوجوان شراب اور عورت کے ہو کر رہ جائیں۔ وہ خود شراب نہ پیتا تھا اور اپنے علاقے میں عورت کے معاملے میں پاکباز مشہور تھا، مگر شہر میں کئی امیر حسین عورتوں کو اپنے جال میں پھنسا کر اس طرح ذلیل و خوار کر چکا تھا کہ وہ خود اپنی نظروں میں سے گر جائیں مگر اُن کے

معاشرتی رُتبے کو کوئی زک نہ پہنچے، غیر امیر حسینائیں اُس کی زد سے محفوظ تھیں۔ اس لئے اِس کی شہرت ایک کامیاب سیاست باز، اِک خوبرو جوان محفل آرا، اِک خوبصورت گفتگو طراز، کی تھی، جو شطرنج اور تاش کا بہت اعلیٰ کھلاڑی تھا، اور دولت کا بہت سلیقے سے استعمال کرنا جانتا تھا۔

ایک دن طاہرہ نے بہت ثقہ بن کر متین سے کہا:۔

"میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ نادر علی خاں سے بیاہ کر لوں مگر جانتی ہوں کہ میرے ابو امی اِس کی اجازت نہیں دیں گے۔ اگر تم اِس معاملے میں میری مدد کرو تو ممنون ہوں گی۔"

"میں تمہاری کیا اور کس طرح مدد کر سکتا ہوں؟"

"ابو امی تمہیں بہت پسند کرتے ہیں، تمہاری ہر بات اُن کے دل میں اُتر جاتی ہے اور وہ ہر دم تم پر ایمان لانے کے لئے تُلے رہتے ہیں۔ لہٰذا تم اُن کو قائل کر سکتے ہو کہ نادر علی کے ساتھ میرا نکاح کر دیں۔"

"تمہیں معلوم ہے کہ نادر علی خاں کئی امیر حسین عورتوں کو اپنے جال میں پھنسا کر ذلیل و خوار کر چکا ہے۔ تم بھی حسین امیر عورت ہو۔ تمہیں کس طرح اور کیوں یقین ہے کہ وہ تمہارے ساتھ وہی سلوک نہیں کرے گا۔ تمہیں اُس کا کیا بھا گیا ہے۔ اُس کی گفتگو دلچسپ، مرصع اور خوش آہنگ ضرور ہوتی ہے مگر تنہائی میں ہمیشہ بے مغز محسوس ہوتی ہے۔ اُس کی خوش ذوقی جمالیاتی احساس کا نتیجہ نہیں، یہ اُس کا کامیاب ترین ہتھیار ہے حسین امیر عورتوں کو پھنسانے کے لئے۔ میری سمجھ میں تو آتا نہیں کہ تم ایسی لڑکی کو اُس نے کیسے اتنا متاثر کر لیا کہ تم اس کے ساتھ نکاح کرنے پر راضی ہو گئی ہو۔ جب تک میں اِس کا قائل نہیں ہو جاتا کہ تم نے نادر علی خاں کو اپنے پورے ہوش و حواس، اپنے پورے علم اور ذوقِ جمال کے ساتھ قبول کیا ہے اور وہ واقعی تمہارا ہمسر اور زوج ہو سکتا ہے، میں کس طرح تمہارے ابو امی کو قائل کر سکوں گا۔ جھوٹ بول کر میں اپنی نظروں میں ذلیل ہونا پسند نہیں کر سکتا اور تمہارے والدین کو دھوکا دینے کا تصور بھی

نہیں کرنا چاہتا۔

"میں اُس سے قطعاً متاثر نہیں ہوں۔ میں اگر کسی سے متاثر ہوں تو تم سے، کسی کو دل و جان سے چاہتی ہوں تو تم کو، اِسی لئے تمہیں اپنے گھر کا معزز ترین فرد بنا لیا ہے۔ اب میرے گھر میں سبھی تمہارا کلمہ پڑھتے ہیں، مگر تم ہو کہ مجھے انسانوں میں شمار کرنے کے لئے تیار ہو مگر ذاتی سطح پر بطور انسان قبول کرنے کے لئے تیار نہیں کیونکہ میں ایک امیر زادی ہوں، میرا خاندان صدیوں سے رئیس ہے۔ کیا کوئی امیر زادہ دُکھ اُٹھائے بغیر، دَرد آشنائی کے جوکھم طے کئے بغیر اِنسان نہیں بن سکتا؟"

"دَرد آشنا ہوئے بغیر ہمدردی ممکن نہیں اور ہمدردی ہی اُن راہوں کو انسان پر کھولتی ہے جن پر چل کر آدم زاد انسان بن سکتے ہیں۔ تم نہ صرف پشتوں کی رئیس ہو بلکہ حسین و جمیل ہو۔ حسین شخص کو بچپن ہی سے ہر شئے بغیر کوشش کے مِل جاتی ہے، خواہش کی اور متحور والدین، بڑے بھائی بہن، جاننے والے، حتیٰ کہ اجنبی، سبھی، سب کچھ حاضر کر دیتے ہیں جب خواہش آرزو نہ بنے، نفسیاتی اور اُلنفسی تبدیلی ممکن نہیں ہوتی؛ خواہش آرزو تبھی بنتی ہے جب خواہش طویل کوشش کے بعد پوری ہونی ممکن ہو۔ اِسی لئے غریب اور محروم والدین کی اولاد کو محض زندہ رہنے کے لئے ایسی ایسی کوشش کرنی پڑتی ہے کہ اُن کے النفس کے اندر آرزوؤں کا اِک جہان جنم لیتا ہے جو اُن کو دُکھ دَرد سے آشنا کرتے ہوئے منزل بہ منزل، آرزوؤں کی تکمیل کی طرف لئے چلا جاتا ہے۔ اِسی لئے تو عیسیٰ کہتے ہیں کہ سوئی کے ناکے سے اُونٹ کا گذر ممکن ہے مگر آسمانی سلطنت میں امیر آدمی کا داخل ہونا محال ہے۔ اِس سفرِ درد آشنائی میں غریب اور محروم لوگوں کو خود آگاہ ہونا پڑتا ہے تاکہ جان لیں کہ کون کون سی صلاحیتیں اُن کو عطا ہوئی ہیں اور اُن کو کس طرح مربُوط و منظّم اور ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے تاکہ آرزوؤں کو بار آور کرتے چلے جائیں۔ ایسے لوگوں کی مثال اُس درخت کی طرح ہے جس کی جڑیں ہر دَم پاتال کی اُور اور شاخیں

آسمان کی طرف بڑھتی جا رہی ہوں۔

اِس کے برعکس اِک امیر زادہ یا امیر زادی، جس کو زندگی کی تمام نعمتیں پیدائش کے لمحے سے ہی فراواں طور پر میسّر ہوں تو اس کی مثال اُس پودے کی طرح ہے جس کا بیج صرف پانی ہی میں کھلتا ہے، جس میں نہ پھول آتے اور نہ پھل لگتے ہیں، صرف ڈرائنگ روم میں آرائش کے کام آتا ہے۔ جس آدم زاد کی جڑیں دھرتی میں نہیں اُس کو ذرا تیز ہوا کا اِک جھونکا بھی زمین سے اُکھاڑ پھینکتا ہے۔

اِسی لئے میں تم سے اُس دوستی کے حوالے سے درخواست کروں گا جو میرے اور تمہارے درمیان ہے کہ تم پہلے اپنی تعلیم مکمل کرو، معالج بنو، اِنسانوں کے دُکھ دَرد سے آشنائی کرو، چند سال۔ مجھے یقین ہے کہ تم ایسی انسان بن جاؤ گی جس کی جڑیں زمین میں دُور تک ہوں گی اور شاخیں ہر دَم آسمان کی طرف بڑھ رہی ہوں گی۔

میں اِس دَرد آشنائی کے سَفر میں تمہارا شریک بن جاؤں گا۔ ہو سکتا ہے کہ ہم دونوں میں ایسی النفسی تبدیلیاں آجائیں کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو اپنے زوج کی حیثیت سے پہچان لیں۔ اگر ایسا نہ بھی ہو تو بھی اتنا تو میں تمہیں اِس لمحے یقین دلا سکتا ہوں کہ میں اُس وقت تک تمہارا شریکِ سَفر رہوں گا جب تک تُم کسی انسان کو اپنے زوج کی حیثیت سے پہچان نہیں لیتیں۔

اگر ایسا نہیں کرتیں تو تمہاری زندگی محض آسائشیں بھری، مزوں بھری، زندگی تو ہو سکتی ہے مگر کبھی بھی ایسی زندگی کو بھرپور زندگی نہیں کہہ سکو گی۔ بھرپور زندگی ہی اصل حیاتِ انسانی ہے، چاہے اس میں دُکھ درد بہت ہی سے کیوں نہ ہوں؛ اس میں سُکھ اور مَسرت اور وجد بھی لازماً موجود ہوں گے۔

اگر دَرد آشنائی کے سَفر کے بغیر ہم دونوں نکاح کر لیتے ہیں تو ہماری زندگی جسمانی، جنسی جمالیاتی، مزوں کی زندگی تو ہو گی مگر اس میں اِرتقا اور اِرتفاع ممکن نہ ہوگا، اِک

یکسانیت ہوگی، منزلوں دُور تک پھیلی ہوئی۔ ہم اِن منزلوں میں، یکسانیت میں محصور و مسدود ہو جائیں گے۔ زندگی ایک جہنّم بن جائے گی۔ ہم ایک دوسرے کو طعنے دیتے رہیں گے: "یہ جہنّم تم نے مجھ پر مسلّط کیا۔" اگر کسی طرح ہماری جدائی بھی ہو سکی تو وہ جُدائی کی زندگی بھی دوزخ بن جائے گی کیونکہ ہم ایک دوسرے کے اس قدر عادی اور محتاج ہو چکے ہوں گے کہ جُدائی کا تصوّر بھی ناقابلِ برداشت ہوگا۔

لیکن اگر تم میرا مشورہ قبول نہیں کرتیں اور تعلیم مکمل کرنے کے بعد نادر علی خاں ہی سے نکاح کرنے کے فیصلہ پر قائم رہتی ہو تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں تمہارے والدین کو راضی کرنے کی ہر ممکن کوشش کر گزروں گا، اگرچہ میں جانتا ہوں کہ اس کوشش میں مجھے تمہارے خاندان کی اور تمہاری دوستی کھونا پڑے گی، جس کا مجھ کو کتنا دُکھ ہوگا اُس کا میں اِس لمحے اندازہ نہیں کر پا رہا ہوں۔ دُکھوں کو بُلانے کا قائل نہیں، مجھ تک پہنچ جائیں، میرا دروازہ کھٹکھٹائیں تو اُن کو مہمان کرنے کی مجھ میں جرأت ہے اور ہمّت اور طاقت بھی۔

میں ایک بار پھر درخواست کرتا ہوں کہ تم اپنے فیصلے کو اُس وقت تک معطّل رکھو۔ جب تک تم اپنی تعلیم مکمل نہیں کر لیتیں تاکہ اگر تمہیں اپنے اس فیصلے پر عمل پیرا ہو جانے کے بعد غلطی کا احساس ہو تو تم اُس زندگی سے واپس آسکو اور نئی زندگی کے سفر پر روانہ ہو سکو۔

نادر علی خاں کے ساتھ زندگی حیاتِ باطل ہوگی۔ تم اور تمہاری صلاحیتیں اِس سے بہتر زندگی کا تقاضا کرتی ہیں۔ اِس بہتر زندگی میں کچھ منزلیں میں تمہارے ساتھ طے کرنا پسند کروں گا، دوستی کے حوالے اور واسطے سے۔"

آخری امتحان میں متین اوّل اور طاہرہ دوئم آئی۔ طاہرہ کے والدین نے دونوں کے اعزاز میں اپنی وسیع و عریض کوٹھی کے وسیع و عریض سبزہ زاروں پر رات کے

وقت ایک پُرتکلف دعوت کا اہتمام کیا، جس میں شہر کے معززین، میڈیکل کالج کے پروفیسر اور دونوں کے ہم جماعت مدعو تھے۔ مہمانوں نے رُخصت کے وقت دونوں کو ایسی نظروں سے الوداع کہی جیسے کہ دونوں اب اِک نئی زندگی کا سفر باہم شروع کرنے والے ہوں اور یہ سفر اُن کے لئے اَزل سے طے ہُوا ہو اور ایک اَبدی نعمت ہو جس کے لئے وہ دونوں سزاوار اور حقدار ہوں۔

جب آخری مہمان بھی رُخصت ہو چکا تو طاہرہ کے والد اُن دونوں کو اپنے خاص کمرے، کہ اُن کا کتب خانہ تھا، میں لے گئے، جہاں اُن کے تنہائی کے لمحے گذرتے تھے، اور اُن سے مخاطب ہوئے۔

"مَیں نے اپنی زندگی میں تم دونوں کے سوا کسی کو اتنا نہیں چاہا۔ تم دونوں پر مجھے فخر ہے۔ تم دونوں میری خوشی کے اَمین ہو۔ مَیں چاہتا ہوں کہ تم دونوں انگلستان طب کی اعلیٰ تعلیم کے لئے چلے جاؤ۔ میں اِس کے لئے انتظامات مکمل کر چکا ہوں۔"

"مَیں اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان نہیں جانا چاہتی۔ مَیں میڈیکل کی تعلیم مکمل کرنا نہیں چاہتی تھی لیکن متین چاہتا تھا کہ میں یہ تعلیم مکمل کر لوں تو پھر اپنی زندگی کے متعلق فیصلہ کروں۔ مَیں نے اُس کا دِل رکھنے کے لئے یہ تعلیم مکمل کی اور امتحان کی دَوڑ میں اُس کے ساتھ ساتھ رہی ہوں۔ متین کے ساتھ وعدہ نبھانے میں مجھے بہت محنت اور مشقت اور اپنے آپ پر کڑا جبر کرنا پڑا۔ اَب میں اِک طویل عرصے تک آرام کرنا چاہتی ہوں اور اُس کے فوراً بعد اپنی زندگی کے مستقبل سے متعلق حتمی فیصلہ کرنا چاہوں گی۔ مجھے آرام کرنے اور فیصلہ کرنے کے لئے مہلت عنایت کریں۔ جو فیصلہ بھی کروں گی آپ کو اُس سے مطلع کروں گی۔ اب بہت تھک گئی ہوں، تھکن سے چُور ہوں، گرا چاہتی ہوں۔ اجازت دیں۔ شب بخیر!"

جب طاہرہ چلی گئی تو اُس کے والد نے متین سے پوچھا کہ وہ تعلیم مکمل کیوں نہ

کرنا چاہتی تھی۔

"طاہرہ جب تک فیصلہ نہیں کرلیتی یہ مناسب نہیں ہے کہ مَیں آپ کو بتاؤں کہ وہ تعلیم کو اَدھورا کیوں چھوڑنا چاہتی تھی۔ یہ دوستی کے تقاضوں کے منافی ہوگا۔ ہمیں اُس کو موقع دینا چاہیئے کہ وہ اچھی طرح سوچ لے کہ وہ اپنی زندگی سے کیا کرنا چاہتی ہے۔ جب وہ فیصلہ کرلیتی ہے تو مَیں آپ کو سب کچھ بتا دوں گا۔ مجھ پر پہلا حق اُس کا ہے۔ دوستی کا تقاضہ یہی ہے کہ مَیں اُسی سے وفا کروں، چاہے اُس کا فیصلہ کچھ بھی ہو۔"

"مجھے تو ابھی سے اُس سے ڈر لگنے لگا ہے کہ کہیں بیٹی غلط فیصلہ نہ کر بیٹھے۔ میں جانتا ہوں کہ اگر اُس کا فیصلہ غلط بھی ہوا تو وہ اُس کو بدلے گی نہیں۔ اُس کا فیصلہ غلط ہوا تو مَیں اُس کو قبول نہیں کروں گا۔ اُس کو بتا دیں۔"

"جب تک وہ فیصلہ نہیں کرلیتی ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ فیصلہ غلط ہوگا۔"

"مَیں صرف ایک ہی فیصلہ قبول کرسکتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اُس نے وہی فیصلہ کیا ہوتا وہ تعلیم کو نامکمل چھوڑنے کا فیصلہ کبھی نہ کرتی اور تم اُس کو تعلیم مکمل کرنے پر مجبور نہ کرتے۔"

"آپ طاہرہ کے فیصلے کا انتظار کرلیں۔"

ہفتہ بھر تو طاہرہ رات بھر سوئے رہنے کے علاوہ دِن کا بیشتر حصّہ بھی سوئی رہتی۔ اس کے بعد دو ہفتے تک وہ سارا سارا دن اپنی وسیع و عریض کوٹھی کے وسیع و عریض سبزہ زاروں میں ٹہلتی رہتی، بے وقت کھانا کھاتی اور رات دیر تک جاگتی رہتی۔ صبح کاذب کے وقت شاید اُس کی آنکھ لگ جاتی، مگر اُس کے کمرے کی روشنی تمام رات صبح تک جلتی رہتی۔ کبھی وہ آدھی رات کے بعد اپنے کمرے سے نکل آتی اور سبزہ زاروں پر تیز تیز چلتی، تاروں بھرے آسمان کو تکتی، کبھی بہت آہستہ خرام

جب وہ تمہیں لے کر پہلی بار گھر آئی تو وہ نئی طاہرہ تھی، وہ سب کی شفیق استاد تھی، وہ مسکرا کر، آہستہ سے ناراض ہوئے بغیر، بتاتی کہ کام کس طرح سلیقے سے نفاست سے، کیا جائے۔ پھر اس گھر میں ہر کام نفاست سے، سلیقے سے، ہنرمندی سے، ہونے لگا، کسی میں کسی طرح کا تناؤ نہ رہا، نفاست ہر فرد میں رچ بس گئی اور ہر اس عمل سے ہویدا ہونے لگی جو طاہرہ کے لئے کیا جاتا، ایسے ہر عمل کو سرانجام دینے والا اپنے اس عمل سے لطف لینے لگا۔

تم دونوں نے اس گھر کی فضا میں اِک انوکھی خوشی، نفاست، آہنگ کو داخل کر دیا، رچا دیا۔ کوئی طاہرہ سے خائف نہیں رہا۔ وہ اور تم ہر ایک کے منظورِ نظر بن گئے۔ میں نے اگر زندگی میں کسی سے پیار کیا ہے تو تم دونوں کی جوڑی سے، نہ اکیلے تم سے، نہ اکیلی طاہرہ سے۔ میں ایک مدت سے اس انتظار میں تھا کہ تم مجھ سے طاہرہ کا رشتہ مانگنے کے لئے اپنے کسی بزرگ کو بھیجو گے مگر ایسا نہ ہوا اور میں پریشان رہنے لگا۔ آج تم آئے تو میں نے تمہارے چہرے مہرے سے، چال سے قیافہ لگایا کہ ایسا کبھی نہ ہو۔ بات تو طاہرہ کے رشتے ہی کے بارے میں تھی مگر تم اس بات میں سے غائب تھے اور یکایک نادر علی خاں میری زندگی میں، میری اجازت کے بغیر، دَر آیا، مجھے اس سے دھچکا لگا۔ نادر علی خاں میں امیرزادوں کے بہت سے عیوب نہیں ہیں، مگر جوڑ توڑ کرنا، بعض کو بعض سے لڑانا، اِس طرح دوسروں کو اپنے قابو میں لانا اور رکھنا اس کا عزیز ترین عمل ہے۔ اِس کے ساتھ ساتھ اس میں امیرزادوں کا ایک عیب 'عورت' اس میں بھی موجود ہے، اگرچہ اس کی نوعیت الگ ہے اور اس میں اِک انفرادیت ہے: وہ عورتوں کے پیچھے نہ تو پھرتا ہے اور نہ اُن پر دولت ضائع کرتا ہے، مگر عورتوں کو، اور وہ بھی امیر اور حسین عورتوں کو، اپنے جال میں پھنسا کر اس طرح ذلیل و خوار کرتا ہے کہ وہ اپنی نظروں میں انتہائی نچلے درجے تک گر جائیں مگر اُن کے معاشرتی مرتبے

کو زک نہ پہنچے۔ اُس میں کسی قسم کی بے ہودگی بھی نہیں۔ وہ مرصّع اور طرح دار گفتگو کرتا ہے، شطرنج اور تاش کا اچھا کھلاڑی ہے۔ حاکموں سے بنا کر رکھتا ہے مگر اُن کا کارندہ لیس نہیں ہے۔ خوش شکل ہی نہیں واقعی خوبصورت ہے اور جواں مَرد ہے۔ میرا دور کا رشتہ دار بھی ہے۔ اگر میں تم سے واقف نہ ہوتا تو اس صورت میں بھی اُس کو داماد بنا لینے پر راضی نہ ہوتا لیکن اَب تو میں تم سے بہت اچھّی طرح واقف ہوں۔ طاہرہ پر تمہارے خوشگوار اثرات سے تین سال سے واقف ہوں اور جس انسانی طرزِ عمل کی تم نمائندگی کرتے ہو اُس کو پسند کرتا ہوں، اس لئے کبھی اِس معاملے میں سوچنا پسند نہیں کروں گا کہ نادر علی خان طاہرہ کا خاوند بنے۔ طاہرہ نے اِنسانی سطح پر جو مقام بنا لیا ہے وہ اس مقام سے نہ تو بلند ہو سکے گی اور نہ اُس مقام پر قائم رہ سکے گی۔ اگر اس نے نادر علی سے نکاح کر لیا۔ میں چاہوں گا کہ طاہرہ پر کسی قسم کا دباؤ ڈالے بغیر اُس کو اُس کے اِس عمل سے باز رکھ سکوں۔ لیکن اگر اُس نے فیصلہ کر ہی لیا ہے تو اس کو بدلے گی نہیں اور نہ بدل سکے گی۔ مَیں نے اس کو کسی منزل سے واپس لوٹ کر آتے نہیں دیکھا۔ وہ جس راہ پر نکلی ہے وہ اُس پہ بڑھتی ہی چلی جائے گی، چاہے اس کو کتنا ہی ناگوار کیوں نہ ہو۔ شکست قبول کرنا شاید ہمارے خاندانی مزاج ہی میں نہیں ہے اور نہ ہی ہم نے کبھی اِس خیال کو اُس کی تربیت کے دَوران میں اُس کے ذہن میں، دِل میں، آنے دیا ہے، داخل کیا ہے۔

میں نادر علی کو اب کبھی اجازت نہیں دوں گا کہ وہ میرے گھر کی دہلیز پار کرے۔ اُس کو طاہرہ کے حوالے سے بھی قبول نہیں کر سکتا۔ یہ تو ممکن ہے کہ وہ طاہرہ کو اپنے اِنسانی مقام پر لے آئے مگر یہ ممکن نہیں ہے کہ طاہرہ اُس کو اُس مقام پر لے جائے جس مقامِ انسانیت پر تم طاہرہ کو لے گئے ہو۔

اگر طاہرہ اِس گھر کو چھوڑ نادر علی کے پاس چلی گئی تو نہ صرف اِس گھر کا کوئی فرد اُس سے تعلق نہ رکھے گا بلکہ مَیں چاہوں گا کہ تم بھی اُس سے کوئی تعلق نہ رکھو، اگرچہ یہ

ہو جاتی، کبھی رُک جاتی، طویل لمحوں کے لئے رُکی رہتی، ساکت ہو جاتی، اپنے تن بدن سے بے خبر ہو جاتی۔ ایسی راتوں میں فضل دین، اُن کے ہیڈ مالی، نے اُس کو اکثر دیکھا۔ وہ رات کے دَوران میں سبزہ زاروں کے مختلف حصّوں کو پانی دینے کے لئے اُٹھ جانے کا برسوں سے عادی تھا۔ طاہرہ کا بچپن سے اُس سے سُلوک تھا: وہ گھنٹوں اُس کے پاس بیٹھی اُس کو کیاریوں میں کام کرتے دیکھا کرتی، کبھی کوئی سوال کر لیتی۔ اِن راتوں فضل دین اُس کو خاموش، دُور سے دیکھا کرتا اور اُس سے بات کرنے کی بالکل کوشش نہ کرتا کیونکہ وہ ہمیشہ سے جانتا تھا کہ طاہرہ جب خود چاہتی ہو تو اُس سے بات کرنا ممکن ہوتی تھی، اُس کی مرضی اور ارادہ شامل نہ ہو تو وہ بات کرنے والے کی طرف اس حیرانی سے دیکھتی تھی کہ جیسے کہہ رہی ہو: تم تو مجھے جانتے ہو، پھر بھی میری تنہائی میں مخل ہوئے ہو؛ تم سے تو اس کی توقع نہ تھی؛ تم نے دوستی کا حق اَدا نہیں کیا۔ ایسی حالت میں طاہرہ کی حیران نگاہوں کا سامنا کرنا محال ہو جاتا اور اِک شدید احساسِ گناہ دِل میں جاگتا، جس کو بُھلانا یا دِل سے رُخصت کرنا کبھی ممکن نہ ہوتا۔ اس لئے فضل دین اپنے کام میں مشغول رہتا اور کبھی کبھی طاہرہ کے سفرِ تنہائی میں چُپکے سے شریک ہو جاتا، لمحے بھر کے لئے، مگر یہ جوکھم اُس کے بس میں نہ تھا کہ ہر بار اُس کو لگتا کہ طاہرہ اس کی نظروں سے ہمیشہ کے لئے جُدا ہونے والی ہے اور وہ اُس کو الوداع کہنے کے لئے لبِ وَا نہ کرے گی؛ اور یہ سبزہ، یہ درخت، یہ پھول، سب، اُس کے سفرِ تنہائی کے خاموش رفیق ہیں اور وہ اُس انجانے سفر سے اُس کو باز نہ رکھ سکیں گے جس پر وہ کمر باندھنے کا اِرادہ کئے تھی اور کوئی اِس اِرادے کی تکمیل میں مزاحم نہ ہو سکے گا۔ کبھی کبھی اُس کا جی چاہتا کہ وہ روئے اور اللہ کے حضور فریاد کرے کہ اللہ طاہرہ کی آرزو بدل دے، مگر اُس کے دل سے فریادِ ہجرت نہ کرتی اور صرف آنکھوں سے آنسو بہتے چلے جاتے اور اس کے کُرتے کا گریبان تر ہو جاتا۔

کبھی کبھی اُس کے دل میں بے اختیار یہ خیال آتا کہ وہ طاہرہ کا راستہ روک کر کہے کہ وہ اُس کو اپنے بچپن کا ساتھی سمجھے اور بچپن کی طرح اپنے من کی بات بے خطر اُس کو کہہ دے۔ اُس کی بات اُس کے کانوں سے اُس کے دل میں چلی جائے گی اور محفوظ ہو جائے گی، کوئی دوسرا اُس سے آشنا نہ ہو سکے گا۔ مگر یہ خیال کبھی ارادے میں، عمل میں، نہ ڈھل سکا۔ وہ طاہرہ کے سفرِ تنہائی کا واحد، خاموش، مگر دلگیر تماشائی بنے رہنے پر قانع رہا کیونکہ ممنون تھا کہ صرف وہی اِس سفرِ تنہائی کا واحد تماشائی تھا اور اس میں طاہرہ کا عزیز ترین اور اکلوتا دوست 'متین' بھی شریک نہ تھا۔

آخر پانچ ہفتوں کے بعد طاہرہ نے متین کو بلا بھیجا۔ ناشتے کے بعد وہ دونوں باغ میں ٹہلنے کے لئے نکل گئے۔ وہ ایک طویل اور کڑیل لمحے تک خاموشی سے ٹہلتے رہے۔ متین نے شدّت سے محسوس کیا کہ طاہرہ سخت کشمکش میں ہے مگر وہ خاموش رہا اور انتظار کرتا رہا کہ طاہرہ کے اندر بھٹیوں سے جو لاوا پک رہا ہے وہ پھوٹ بہے۔ وہ جانتا تھا کہ پھوٹ بہنے سے اُس کو بہت اذیت ہو گی اور خود اُس کو ناگوار فیصلہ کرنا پڑے گا، جس سے اُس کی اپنی زندگی یا طاہرہ کی زندگی کو شدید گزند پہنچے گا۔

"جس دن ہم تم کلاس روم سے باہر پہلی بار ملے اُس دن کالج کے گلزار میں بہار کا آخری گلاب کا پھول تیز ہوا میں ڈول ڈول گیا اور میری زندگی کا استعارہ بن گیا۔ اب تمہاری دوستی بھی ایسا ہی استعارہ بنا چاہتی ہے۔

زندگی میں بحیثیت عورت مجھے دو مَردوں نے متاثر کیا: تم نے اور نادر علی خاں نے۔ تم نے مجھے بہت سی سطحوں پر متاثر کیا؛ اِن تمام سطحوں پر جو مجھ میں موجود ہیں مَیں یہ بھی جانتی ہوں کہ میں نے بھی اُن تمام سطحوں کو متاثر کیا ہے جو تمہارے اندر مری اُلفسی سطحوں کے مُتبّل ہیں۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تمہارے الفس میں ایسی سطحیں اور ایک ایسی صلاحیّت ہے جو مجھ میں نہیں ہے؛ اور وہ ایک صلاحیّت تمہارے اُس

روّیے کا تعین کرتی ہے جو تمہارا میرے ساتھ رہا ہے، اور ہے۔ مَیں اس صلاحیت کو کوشش کے باوجود، جان نہیں سکی؛ لہٰذا اپنے تئیں اِس کو روح کا نام دیتی ہوں میں یہ بھی جانتی ہوں کہ مَیں روح سے محروم نہیں ہوں مگر تمہاری روح میری روح سے یکسر مختلف ہے اور دونوں کے درمیان کبھی کلام ممکن نہیں ہوا، شاید اِس لئے کہ میری زندگی کے فیصلے آخر کار میری روح صادر نہیں کرتی جس طرح کہ تمہاری روح کرتی ہے۔

میں یہ بھی جانتی ہوں کہ کئی بار تمہارے اندر سے بڑے زور سے تحریک ہوئی کہ تم اُس تنہائی کے دَوران میں، جو ہم تم کو اکثر میسر رہی اور جس میں خلل ڈالنے کی جرأت کسی کو نہیں ہوئی، میرے کسی اَنگ کو چھوؤ مگر کسی طاقت نے اِس تحریک کو بے اثر کر دیا۔ کیا یہ ممکن نہیں تم اس تحریک کی سُن لو اور اُس کے مطابق عمل پیرا ہو جاؤ۔ مجھ سے نکاح میں تمہیں کیا قباحت محسوس ہوتی ہے، نظر آتی ہے؟ اگر نباہ نہ ہوا تو علیحدگی ہو سکتی ہے۔ تم مرد ہو تمہیں طلاق دینے میں بہت آسانی ہے۔"

"تم مجھے بھاتی ہو، لبھاتی ہو، للچاتی ہو: تمہارا جسم، تمہارا ذہن، تمہارا تخیل، تمہاری قلبی کیفیات مجھے اتنی پسند ہیں کہ بارہا مَیں نے سوچا کہ تمہارا ہو جاؤں مگر اپنے اندر کہیں عمیق گہرائی میں مَیں نے ہمیشہ محسوس کیا ہے کہ مَیں اور تم مِل کے اِک ایسی اکائی نہیں بناتے جو شخصیتوں کو پروان چڑھائے، اُن کے اِرتقا اور اِرتفاع کی ضمانت دے۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ میرا تمہارا ملاپ چند برس تک بے شمار مزوں اور ذائقوں سے آشنا کرائے گا، ہمیں زندگی بہت سُہانی نظر آئے گی۔ مگر مزے اور ذائقے کسی ایسی فصل کو جنم نہیں دیتے جو روح اور رَواں کو تازگی اور تقویت اور مسلسل حیات نو دیتی چلی جائے اور پھر حیاتِ آخر تک لے جائے اور وہاں اذنِ قبولیت مِل جائے؛ اِن سے پیاس بجھتی نہیں۔ اشتہا کی تسکین نہیں ہوتی؛ بلکہ پیاس اور اشتہا تیز ہوتی چلی جاتی ہے؛ مزوں اور ذائقوں کی ہر دَم تلاش رہتی ہے؛ طبیعت ہر دَم تنوّع چاہتی ہے، مگر مزوں اور ذائقوں

کی زندگی جلد اختتام کو پہنچ جاتی ہے لیکن آدمی کو اس حد تک عادی بنا دیتی ہے کہ ہر دم اُن کی طلب اور حاجت شدید رہتی ہے اور آدمی طلب کے تقاضوں میں محصور و مسدود ہو جاتا ہے، زندگی ایک مسلسل یکسانیت بن جاتی ہے جس سے طبیعت گریز کرتی ہے اور گریز ممکن نہیں ہوتا۔

اگر میں تم سے نکاح کے بعد یکسانیت کی زندگی کے سبب الگ ہو بھی جاؤں تو جسم و جاں اس حد تک مزے، ذائقے اور چٹخارے کے عادی ہو چکے ہوں کہ علیحدگی اور فراق سے مسئلے کا حل ممکن نہیں ہوگا کہ میری تمہاری حالت نشے کے مریض کی سی ہو جائے گی: ہر دم نشے کی طلب اور تلاش رہے گی اور اس کی خوراک میں اضافے کی ضرورت تاکہ سرور کی کیفیت کم نہ ہونے پائے۔ نشے کی پیاس کی یکسانیت کے صحرا میں ہم دونوں کو اُن اُونٹوں کی طرح سرگرداں پھرائے گی جن کو جھوٹی بھوک لگتی ہے۔ اور وہ کبھی سیر نہیں ہو پاتے اور صحرا میں سرگرداں پھرتے پھرتے راہ گم کر بیٹھتے ہیں اور آخر بھوک اور پیاس کی شدّت سے بے تاب ہو کر مر جاتے ہیں۔ یہ ہم دونوں پر ظلم ہوگا اور کئی دوسرے ظلم کو جنم دے گا۔ یہ عاقبت مجھے منظور نہیں ہے۔"

"تو میرے لئے نادر علی خاں مُقدّر ہے؟"

"نہیں تو۔ طب کے علم کو لوگوں کے دُکھ درد دُور کرنے کے لئے استعمال کرو، معالج کی زندگی کو اپناؤ۔ دردآشنائی کا سفر اختیار کرو تو تمہارے کردار میں ایسی تبدیلیاں آتی چلی جائیں گی کہ تمہارا کردار شخصیت میں بدل جائے گا اور ایسا ارتقا ہوتا رہے گا جو ارتفاع کی طرف محوِ سفر رہے گا۔ ممکن ہے ایسے سفر میں ایسا شخص تمہیں مل جائے جو تمہارا زوج ہو اور جس کو تم اپنے زوج کی حیثیت سے پہچان سکو اور قبول کر سکو اور وہ بھی تمہیں پہچان لے اور قبول کر لے۔ اگر ایسا نہ بھی ہو تو بھی تمہاری شخصیت زوج نہ ہونے کی کمی کو محسوس نہ کرے گی کیونکہ خالق و رب، غفور و رحیم، باری

مصوّر، ستّار و رؤف، ایسی صفات تم میں پیدا ہو جائیں گی اور یہ صفات زندگی کو اتنی بھرپور کر دیتی ہیں کہ اس سفر ہی کے ساتھی زوج کے مترادف بن جاتے ہیں۔

اگر تم اِس سفر پر نکلنا پسند کرو تو مجھے اُس وقت تک اپنے سفر کا ساتھی پاؤگی جب تلک تمہارا زوج تمہیں مل نہیں جاتا یا تم میں خالق و رب، غفور و رحیم، باری و مصوّر، ستّار و رؤف، ایسی صلاحیتیں رونما نہیں ہو جاتیں اور تم زوج کی حاجت سے بے نیاز نہیں ہو جاتیں۔

"مسیحا کا ۔۔۔ مجھے قبول نہیں کہ اس کا انجام صلیب پر چڑھنا ہوگا۔ میں مصلوب ہونے کے لئے تیار نہیں کہ میں آسمانی باپ کا اکلوتا بیٹا نہیں اور میری تصلیب سے انسانوں کی نجات ممکن نہیں ہوگی۔

اب تم اپنا وعدہ پورا کرو اور ابّو امّی کو راضی کرو کہ وہ مجھے نادر علی خاں کی زوجیت میں دے دیں۔"

ایک دن متین نے طاہرہ کے والد سے وقت طلب کیا تاکہ وہ طاہرہ کے فیصلے سے اُن کو آگاہ کرے اور اِس فیصلے سے پیدا ہونے والے مسائل کے بارے میں گفتگو کرے۔ انہوں نے اس کو اگلے دن، رات کے کھانے پر مدعو کیا۔ کھانے کے بعد وہ دونوں طاہرہ کے والد کے خاص کمرے میں منتقل ہو گئے۔ اِس کمرے میں طاہرہ کے بچپن سے لے کر جوانی تک کے مختلف زمانوں میں لی گئی تصاویر اور متین کے ہمراہ طاہرہ کی تصویریں دیواروں پر ٹنگی یا اُن کے کام کرنے والی میز پر رکھی تھیں۔ اِس سے متین پر شدت سے کھلا کہ اُن کو طاہرہ اور خود اُس سے کس قدر اُنس و اُلفت تھی۔ اُس کے قلب و ذہن کو دھچکا سا لگا کہ وہ اس اُنس و الفت کے عوض اُن کو ایسا صدمہ پہنچانے والا ہے کہ جس کا کوئی مُداوا نہیں اور جو نجانے اُن کو کتنے برس تک سہنا ہو۔

"طاہرہ بیٹی نے کیا فیصلہ کیا ہے؟"

"وہ چاہتی ہے کہ آپ اُسے نادر علی خاں کی زوجیت میں دے دیں اور اُس نے مرے ذمے یہ فرض لگایا ہے کہ مَیں آپ کو قائل کروں یہ فیصلہ درست ہے اور آپ اس فیصلے کو قبول کرنے پر رضامند ہو جائیں۔"

"کیا وہ جانتی ہے کہ نادر علی کتنی امیرزادیوں کو ذلیل و خوار کر چکا ہے؟"

"جی ہاں۔ اُس کو اگر کوئی اچھی طرح جانتا ہے تو وہ طاہرہ ہی ہے اور نادر علی خاں بھی جانتا ہے کہ طاہرہ اس کے کردار سے بخوبی واقف ہے اور اُس کے کردار کو قبول کرتی ہے۔"

"تو وہ اُس کا شکار کیوں بننا چاہتی ہے؟"

"وہ اُس کا شکار نہیں اس کی منکوحہ بننا چاہتی ہے۔"

"تم نے اُس کو سمجھایا کہ نادر علی سے نکاح ہمیں قابلِ قبول نہ ہوگا اور وہ اُس کو کبھی خوش نہ رکھ سکے گا کیونکہ وہ اُس کی صلاحیتوں سے یقیناً آشنا نہیں۔ لہٰذا اُن کو بارآور کرنے کے لئے وہ ماحول اور سامان مہیّا نہ کر سکے گا جو اِن صلاحیتوں کی پرورش کے لئے ضروری اور لازمی ہے۔"

"سمجھایا ہے، مہینوں، مگر مَیں اُسے قائل نہیں کر سکا۔ شاید اُس کو یقین ہے کہ وہ نادر علی خاں کی صورت گری پر قادر ہو سکے گی اور وہ اِک خلقِ جدید بن جائے گا جو اُس کا صحیح زوج اور صحیح ساتھی ہو گا۔"

بعض درخت ساتھ ساتھ لگائے جائیں تو وہ ایک دوسرے کو پروان چڑھنے، پھلنے پھولنے میں بہت مددگار ہوتے ہیں، لیکن اگر اُن کو ایک دوسرے کے ساتھ پیوند کرنے کی کوشش کی جائے تو وہ دونوں پروان نہیں چڑھتے اور مُرجاتے ہیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے اچھے دوست تو ہو سکتے ہیں، میاں بیوی کی حیثیت سے ایک دوسرے کے زہر ہیں۔ وہ بچپن سے آسائشوں کی، جسمانی، نفسیاتی اور ذہنی آسائشوں کی اِس

حد تک خوگر ہوگئی ہے کہ وہ کوئی دوسری زندگی کا تصور بھی نہیں کرنا چاہتی جہاں آسائشوں کو مہیا کرنے کے لئے خواہش سے آرزو اور شدتِ آرزو کے مراحل طے کرنے ناگزیر ہوں۔ ایسی آسائشوں کی زندگی نشے کی زندگی ہے جو انسان کو نشے کا عادی اور قیدی بنا دیتی ہے۔ جب اِس نشے کا عادی اور قیدی اِس نشے کے حبس کو محسوس کرتا ہے (اُس کا محسوس کرنا بھی نشے کے سفر کا ایک لازمی مرحلہ ہے) تو وہ اِس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کے قوار اور اُس کی نفسیاتی اور ذہنی حالت اتنی بے دفاع اور کمزور ہو چکی ہوتی ہے کہ وہ بالکل بے بس ہو جاتا ہے اور اس بندی خانے سے نکل آنا اُس کو نہ صرف محال بلکہ ناممکن نظر آتا ہے، وہ مایوس ہو جاتا ہے، بندی خانے کے دَر و دیوار سے ٹکریں مار مار، ایڑیاں رگڑ رگڑ، گھُٹ کے مَر جاتا ہے۔

اِس معاملے میں طاہرہ سے مفصّل گفتگو ہوئی ہے۔ مَیں نے اُس کو مشورہ دیا تھا کہ وہ طب میں مشق شروع کرے، بیماروں کے دُکھ دَرد کی دَوا کرنے کی زندگی کا آغاز کرے تاکہ آسائشوں کی زندگی سے نکل جائے، اِک کردار سے شخصیت بن جائے، اس میں نئی نئی صلاحیتیں پیدا ہوں اور اُن کے باہمی ربط و ضبط سے وہ خود بدل جائے اور یوں اُس کا مقدر بھی بدل جائے اور نادر علی خاں اُس کی حاجت نہ رہے۔ مگر وہ اِس سفر کو مسیحا کا سفر گردانتی ہے جس کا انجام لازماً صلیب پر چڑھنا ہے۔ وہ اِس انجام کو قبول نہیں کرتی۔ لہٰذا وہ اپنے آپ کو بدلنے کے لئے تیار نہیں۔ اِس لئے موجودہ حالت میں نادر علی خان ہی اُس کا مُداوا اور ملجا ہے۔"

"جس دِن سے طاہرہ نے چلنا پھرنا شروع کیا اُس کو خوبصورت چیزیں، خوبصورت جانور، خوبصورت لوگ، بہت پسند آتے۔ سبھی بچّوں کو پسند آتے ہیں۔ مگر اُس کے ساتھ ساتھ اُس بد وضع، بدشکل، بدنما، بے ڈول اشیاء، جانوروں، لوگوں سے کراہت ہوتی اور وہ شدت سے اپنے جذبات کا اظہار کرتی۔ مَیں نے اہتمام کیا کہ اُس سے بدشکل،

بدنما، بے ڈول، اشیاء، جانور، لوگ دُور رہیں۔ اُس زندگی میں ہمارا ہیڈ مالی فضل دین واحد اِنسان ہے جو بدصورت ہونے کے باوجود اُس کو پسند تھا اور اب تک ہے۔ مَیں نے اِس پر بہت غور کیا تو مجھے احساس ہوا کہ اس کی سیاہ فام، معمولی بے ڈول شکل وصورت میں اِک خاص تناسب ہے جو اس کی بدصورتی کو اِک تمکنت عطا کرتا ہے۔ اس کے ہاتھ جس شئے کو لگ جائیں وہ ہری ہو جاتی ہے، پھولنے پھلنے لگتی ہے۔ لڑکپن میں طاہرہ کی اُس سے گاڑھی چھنتی تھی، وہ فضل دین کے ساتھ پھولوں کی کیاریوں میں بیٹھی اُس کو کام میں مصروف دیکھنے میں محو رہتی گھنٹوں۔ وہ جہاں جہاں اپنے کام کے لئے جاتا وہ اُس کے ساتھ لگی رہتی۔ خود فضل دین بھی جب کوئی کام کرتا ہے تو اس میں ڈوب جاتا ہے اور اُس کے اندر سے نور پھوٹتا ہے جو اُس کے چہرے کو عجب شان عطا کر دیتا ہے، جو حُسن کی ہمزاد نظر آتی ہے۔ بچپن میں طاہرہ کو میں نے صرف فضل دین کے ساتھ امن میں دیکھا۔ جب وہ سوچنے، پڑھنے لکھنے کے قابل ہوئی تو اُس کی نفاستِ طبع گھر والوں کے لئے، اُستادوں کے لئے، اُس کے ہم جماعتوں کے لئے کڑا امتحان بن گئی۔ وہ اکثر لوگوں کے بے ڈھب پن سے، بے سلیقگی سے، دِل برداشتہ ہو جاتی، ناراض ہو جاتی، گھر میں سب کوشش کرتے کہ ہر کام نفاست سے ہو، مگر جب ہر کام اِس قدر شعوری کوشش سے کیا جائے تو کہیں نہ کہیں کمی اور جھول رہ جاتا ہے۔ جہاں کمی رہ گئی وہاں طاہرہ کا غصّہ بے قابو ہو جاتا، جو کبھی دوسروں کے لئے کبھی خود اُس کے لئے عذاب بن جاتا۔

ایک دن ایسا آیا کہ وہ گھر میں آئی اور اُس کی نگاہیں دوسروں کے عیوب، کوتاہیوں، کمیوں سے بے نیاز تھیں، وہ بے ڈھب چیزوں پر، اعمال پر، ناراض نہ ہوئی، بس مُسکرا دی، جیسے کہہ رہی ہو کہ تم جس ردِّعمل کی توقع رکھتے ہو وہ اب نہیں ہوگا؛ میں نے نیا انداز اپنا لیا ہے۔ اُس دن کے بعد اُس کا نیا انداز آج تک قائم ہے۔

تقاضہ کرنے کا مجھے کوئی حق نہیں ہے کیونکہ تم طاہرہ کے دوست ہو اور اُسی کے حوالے اور واسطے سے اِس گھر کے معزز رُکن ہو اور یہ نعمت مجھے اُس کے واسطے سے ملی ہے۔

مَیں جانتا ہوں کہ اگر مَیں نے طاہرہ کو کھو دیا تو تمہیں بھی کھو دوں گا۔ اس کا مجھے بہت دُکھ ہوگا۔ مَیں اور اِس گھر کے ہر فرد نے تم سے بہت کچھ پایا ہے۔ مَیں چاہوں گا کہ اگر طاہرہ اِس گھر سے بے وفائی کرے تو تم اس سے بے وفائی نہ کرنا۔ لیکن افسوس ایسا نہیں ہو سکے گا۔ تم طاہرہ کی بے وفائی کے لئے اپنے آپ کو ذمہ دار گردانو گے اور ایک سطح پر ہی نہیں کئی سطحوں پر، یہ فیصلہ صحیح ہوگا۔ میں تمہارے فیصلے کو قبول کرلوں گا، کیونکہ یہ ایک اچھے انسان کا فیصلہ ہوگا۔

جب تم طاہرہ سے ملو تو اُس کو اِس ساری گفتگو سے آگاہ کر دینا۔ وہ جب تک اِس گھر میں رہنا چاہے اُس کو وہ سب پیار، احترام، مراعات، حاصل رہیں گی، جس کی وہ اپنے آپ کو ہمیشہ سے حقدار سمجھتی چلی آ رہی ہے؛ یہاں سے چلے جانے سے کوئی اُس کو روکے گا نہیں، مگر جب وہ اِس گھر کو چھوڑ کر چلی جائے گی تو اِس گھر کے دروازے اُس پر بند ہو جائیں گے اور پھر کبھی نہ کھُلیں گے۔

میں اُس کو اپنے دل سے، خیال سے، یادداشت سے نکالنے کی کبھی کوشش نہ کروں گا۔ وہ مجھے ہمیشہ عزیز رہے گی اور مَیں نے تین سال اُس سے تمہارے حوالے اور واسطے سے، بہت بھرپور پیار کیا ہے۔ مَیں اس پیار کو مٹانے کی، تباہ کرنے کی، کبھی نہ سوچوں گا کہ یہ میری عزیز ترین متاع ہے۔ اُس کی یاد میرے دل میں روشنی کئے رکھے گی تا آنکہ موت کا اندھیرا اس دل اور جان کو آلے۔ میں طاہرہ سے وابستہ یادوں کو زندہ رکھوں گا مگر اُس کو زندوں میں شمار نہیں کروں گا۔ مَیں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ چلی گئی تو اس پر کچھ ہی بیت جائے وہ پھر لوٹ کر نہیں آئے گی اور نہ ہی وہ اپنی

خبر بھیجے گی، وہ سب کچھ سہے گی اور اُف نہ کرے گی۔ وہ اپنے ماں باپ کی بیٹی ہے: باغیرت اور باہمت اور جرأت مند۔

آؤ! باغ میں میرے ساتھ ٹہلو، پھر نہ جانے ملاقات ہو نہ ہو"۔

چند ہفتوں کے بعد فجر کی نماز کے لئے جب فضل دین اپنے گھر کا لوہے کا دروازہ کھول، لوہے کا کُنڈا دوبارہ اپنے مقام پر قائم کرکے کوئی دس قدم ہی گیا تھا کہ اُس کے کانوں میں لوہے کا دروازہ دوبارہ کھُلنے اور کنڈے کو اپنے مقام پر قائم کرنے کی آواز آئی۔ وہ یک لخت پلٹا کہ دیکھے کون اُس کے پیچھے گھر سے نکلا ہے۔ طاہرہ اُس کے بند دروازہ کے ساتھ ساکت کھڑی تھی اور لمحے بھر کے بعد وہ وہاں سے ہلی اور مکان کے مغرب کی طرف تیز تیز قدم اُٹھائے چل دی۔ وہ خالی ہاتھ تھی۔ وہ تھوڑی دُور جاکر رُکی اور اِدھر اُدھر دیکھا۔ جنوب کی طرف برگد کے درخت تلے ایک سیاہ موٹر کار کھڑی تھی اور اُس کے پاس ایک مرد ساکت کھڑا تھا۔ طاہرہ کو دیکھ کر وہ آگے بڑھا اور سرگوشی کی: "طاہرہ!" جواب میں طاہرہ نے سرگوشی کی: "نادر!"

فضل دین بُت بنا یہ منظر دیکھا کیا۔ دونوں کار میں سوار ہوئے اور چل دیئے۔

کچھ دیر تک تو اس میں چلنے کی سکت ہی نہ رہی۔ پھر وہ یکایک چونکا اور مسجد کی طرف روانہ ہوگیا۔ مسجد میں پہنچ وہ اللہ کے حضور جھُک گیا اور نماز کے بعد وہ طاہرہ اور نادر کے لئے دیر تک دُعا کرتا رہا۔ اُس نے اس واقعہ کی خبر کسی کو نہ کی۔ جب میں بڑے صاحب سے آخری بار مل کر کوٹھی سے نکل رہا تھا تو فضل دین نے اُس سے طاہرہ سے متعلق وہ تمام کوائف بیان کئے جو اس کی آنکھوں نے دیکھے تھے کیونکہ وہی طاہرہ کا اکلوتا دوست تھا اور اُس کا منظورِ نظر بھی تھا جس سے وہ اڑھائی تین برس بہت ہی خوش رہا تھا اور طاہرہ اور اس کے بارے میں بہت سُہانے خواب دیکھا کرتا تھا، جو خواب طاہرہ کے نادر کے ساتھ چلے جانے سے بے تعبیر رہ گئے۔

تھے۔ اس لئے اُس نے سمجھا کہ میں اس بات کا حقدار ہے کہ وہ جان لے کہ طاہرہ پر ہفتوں بھر کیا بیتتی رہی اور وہ اپنے آبائی گھر سے کس طرح خالی ہاتھ روانہ ہوئی تھی۔

"میری طاہرہ بی بی چلی گئی۔ وہ اب کبھی لوٹ کر نہیں آئے گی۔ اب آپ کے لئے اس گھر میں کون ہے جس کو ملنے کے لئے آپ آئیں گے۔ نین ترس جائیں گے آپ دونوں کی صورتوں کے لئے.... میری دعا ہے آپ دونوں جہاں بھی رہیں خوش رہیں، ثمر بار رہیں۔ میں اب دعا ہی کر سکتا ہوں"۔ اللہ حافظ و ناصر ہو آپ دونوں کا۔"

اُس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ اُن کو چھپانے کے لئے وہ مڑا اور اپنے گھر کے اندر داخل ہو گیا۔

۳

شرجیل میاں! میں بچپن سے درد آشنا ہوں۔ میں تین برس کا بھی نہیں تھا جب میرے والد کو راہ چلتے ہوئے اُن کے اپنے گاؤں میں علاقے کے انگریز حاکم کی بندوق سے اچانک گولی لگ گئی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گئے۔ میں بچپن میں یتیم اور میری ماں جوانی ہی میں بیوہ ہو گئی۔ یہ میرا پہلا صدمہ تھا اور درد سے میرا پہلا تعارف۔ اس کے بعد دکھ اور درد میرا در کھٹکھٹاتے رہے اور میں اُن کی مہمانداری میں مصروف رہا۔ جس گاؤں میں میرے والد کو گولی لگی اس کا بیشتر حصّہ میرے آباء کی ملکیت تھا اور اب میں اس کا مالک ہوں۔ اسی لئے رزق کی تنگی سے میں آشنا نہیں ہوا اور نہ کسی مالی مشکل سے مگر یہ بات میرے دکھ درد کا مداوا نہیں اور نہ ہی میرے زخموں کا مرہم بن سکی۔ رنج و الم میرے تعاقب میں رہے ہیں۔

اس کے برعکس طاہرہ ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئی جو صدیوں سے رئیس ہے، جس کے ورثے میں علم و فضل ہمیشہ شامل رہا، جو کئی پشتوں سے دکھ اور درد اور

کرب و آفت سے نا آشنا ہے۔ طاہرہ اپنے بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹی اور حسن و وجاہت، عقل و ذوق، علم و وجدان میں سب سے سرفراز۔ اس کی پرورش ناز و نعم میں ہوئی اُس کی خواہش دوسروں کے لئے حکم رہی ہے اور وہ اس حکم کی بجاآوری میں دل و جان سے مصروف رہے ہیں۔ وہ اپنی راحتوں اور مسرتوں کے لئے کسی کی دست نگر نہیں رہی۔ اُسے اپنے بڑے بہن بھائیوں سے نہ صرف گہری اُلفت ملی بلکہ ایسا احترام و تکریم جس کو پرستش کہا جائے تو مبالغہ نہ ہو۔ نوکروں اور ملازموں نے خدا کا مقرر کیا ہوا حکم سمجھ کر اس کی دل و جان سے اطاعت کی، دلجوئی کی، خوشامد کی جس میں جھوٹ اور مطلب براری نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس کی وجہ نہ صرف اُس کے خاندان کی طلسماتی دولت اور جاہ بلکہ طاہرہ کا ذاتی حسن اور وجاہت اور مزاج کی نفاست بھی تھی۔ اُس کو دیکھ کر دل میں وسعت کا احساس ہوتا تھا اور اللہ کی مہربانی کا۔ کہ طاہرہ کا قرب نصیب تھا اور اس کی خدمت کا موقع میسّر۔

لہٰذا اس نے کسی حاجت کو جسم و جان میں کبھی محسوس ہی نہ کیا تھا، اُس کی کوئی خواہش آرزو کی منزل تک نہ پہنچ پائی۔ خواہش خیال سے زبان تک آنے سے کبھی نہ ہچکچائی اور جب زبان پر آئی تو ہر ایک کے لئے حکم بن جاتی جس کی اطاعت لازم اور ناگزیر ہو جاتی۔ اُس نے اپنے خاندانی ورثے میں اعلیٰ اشیاء، اعلیٰ اعمال، اور حسین چیزوں کے لئے ذوق بلا مزد و محنت پایا۔ اس کے علاوہ علم کا ذوق و شوق ورثے اور ذہن میں ودیعت ہوا تھا۔ لہٰذا اُس کی زندگی کے مسائل بغیر ایسی کوشش کے حل ہو جاتے جس سے جبین اور بدن پر پسینہ آئے یا ماتھے پر شکن پیدا ہو۔ اُس نے مصوری، ادب، موسیقی سے گہری شناسائی حاصل کر لی تھی اور اُن کے باہمی امتزاج سے اپنے تخیل کی بہت اعلیٰ پرورش کی تھی۔ وہ حظ اور استراحت کی اِس قدر عادی ہو گئی تھی کہ وہ ہر رشتے، جذبے، خیال اور احساس سے صرف حظ اور استراحت ہی

چاہیے لگ گئی تھی۔ وہ بے آرامی، اضطراب، تضاد، ابہام اور لغزش سے اپنی روزمرہ زندگی میں ناآشنا رہی، اگرچہ وہ اُن کا شعور ادب کے حوالے سے ضرور رکھتی تھی، مگر اُس کے انفس و آفاق میں اُن کا کوئی مقام نہ تھا۔

جب اُس سے میری دوستی ہوئی تو اُس نے جسمانی، نفسیاتی، ذہنی، تخیلی آسائشوں سے میری خاطر مدارات کی، دلجوئی کی، لبھایا، رجھایا۔ میں اُن آسائشوں کے لئے للچایا بھی مگر میری شخصیت کے میلان نے اُس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ میرے تجربے اور علم اور فکر و غور نے مجھے سُجھایا اور سمجھایا کہ آسائش اور استراحت انسان کے لئے نشہ ہی ہے جب تک اِس کے ساتھ دُکھ اور درد سے گہری آشنائی نہ ہو اور اُن کے مقام و مقصود اور تفاعل سے آگاہی نہ ہو۔ دونوں کے امتزاج اور ازدواج سے ہی انسان کا انفسی اِرتقا ممکن ہوتا ہے اور پھر یہ اِرتقا ارتفاع کی منازل طے کرتا ہوا احسن التقویم کی منزل تک لے جاتا ہے اور اللہ کے رنگ میں رنگا جانا ممکن ہو جاتا ہے۔ اگر انسان دُکھ اور دَرد کو سزا اور عذاب سمجھے اور اُن سے گریز کرے تو وہ حظ اور مزے اور استراحت کے نشے کا اس قدر عادی ہو جاتا ہے کہ وہ محدود مسدود اور محصور ہو جاتا ہے اور اُس کے نشے کی طلب بڑھتی ہی چلی جاتی ہے اور اس کی ہر خوراک میں اضافہ ناگزیر ہوتا چلا جاتا ہے۔

طاہرہ کی دوستی مجھے اُس دَوراہے پر لے آئی جہاں مجھے یہ انتخاب کرنا لازم ہو گیا کہ اس کے ساتھ نکاح کے رشتے میں بندھ جاؤں یا اُس سے انکار کر دوں اور اُس کی دوستی کو خیرباد کہہ دوں۔ سرمحی الدین چاہتے تھے کہ میں طاہرہ سے نکاح کروں اور طاہرہ بھی اس رشتے کو اپنانا پسند کرتی تھی۔

آخر مجھے اپنے انفسی ارتقا کو طاہرہ کی دوستی اور اُس سے نکاح پر ترجیح دینی پڑی۔ مَیں آج تک اس پر قطعاً نادم نہیں ہوں اور اپنے فیصلے کی صحت کا قائل پہلے سے

بھی زیادہ ہوں کیونکہ اب میرے تجربے، علم اور النفسی ارتقا نے اس کے لئے مکمل ثبوت مہیا کر دیا ہے۔ اگر یہ ثبوت مہیا نہ ہو جاتا تو مجھے دُکھ اور درد کو شر، اللہ کو شر کا خالق یا شر کے لئے ایک دوسرا خالق ماننا پڑتا اور یہ تینوں صورتیں انسان کے احساسِ جمال، نظامِ کائنات اور نظمِ انسان کی تردید اور تنقیص کرتی ہیں؛ لہٰذا اُن کو قبول کر کے ذہن اور قلب اور تخیّل انتہائی یاس اور ناامیدی کا شکار ہو جاتے ہیں اور زندگی بے معنی۔ اس صورتِ حال کو قبول کر کے آدمی کے لئے انسان ہونا اور رہنا محال ہی نہیں ناممکن ہو جائے۔ ایسی صورت میں یہ ممکن نہیں کہ زندگی کو معنی خود اپنی کوشش اور جوکھم سے دے لئے جائیں کیونکہ بے معنی جہاں میں بامعنی زندگی کا امکان انسانی تصوّر کے لئے ممکن نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ معنی اُس کے گِرد وپیش کے باہمی رشتوں ہی سے وجود میں آ سکتے ہیں (انسانی زندگی اس جہانِ رنگ و بُو اور اس کائناتی نظام میں ہی وجود میں آ سکتی تھی۔ عدم سے وجود تک اور اس کے ارتقا کی تمام کڑیوں میں لازم وملزوم کا رشتہ صاف نظر آتا ہے)۔ اور بے معنی جہاں سے رشتے کی نوعیت کسی طور بامعنی قرار نہیں پا سکتی۔ اگر پھر بھی بحث کی خاطر یہ مان لیا جائے کہ بے معنی جہان میں بامعنی حیاتِ انسانی ممکن ہے تو پھر یہ ماننا بھی ناگزیر ہو جائے گا کہ جہان اور انسان ایک مربوط ترکیب کے مختلف منازل نہیں بلکہ اُن کو خلق کیا گیا ہے اور ہر ایک کا جدا جدا خالق ہے یا اُن دونوں کا خالق ایک ہے مگر بُد ہے جو ایک بے معنی کائنات میں اِک بامعنی مخلوق کو پیدا کر کے دونوں کے باہمی تضاد و تنقیص اور تخریبی کشمکش کا مزا لیتا ہے۔ ایسا تصوّر کرنا بھی نہ صرف عذاب ہے بلکہ اس سے بڑا عذاب تصوّر میں آ ہی نہیں سکتا۔

شرجیل ایک طویل لمحے تک خاموش رہا۔ متین صاحب چُپ رہے اور اس انتظار میں کہ شرجیل خود کلام کی حاجت محسوس کرے۔ آخر شرجیل نے اِک لمبا سانس

لیا اور متین صاحب سے آنکھیں چار کیں اور گویا ہوا :۔

"آپ نے یکایک مجھے اک ایسی بلندی پر لا کھڑا کیا جہاں سے بہت سی مملکتوں کو میرا ذہن، مرا تخیل، دیکھ سکتا ہے۔ یہ مملکتیں للکار رہی ہیں کہ ہمارا احاطہ کرو اور سوال کرتی ہیں کہ احاطہ کر سکو گے ؟ مرے دل میں کئی دَر اور کئی کھڑکیاں یک بیک کھُل گئی ہیں۔ مختلف قسم کی ہوائیں میرے اندر چلنے لگی ہیں، نئی نویلی، انوکھی عجب عجیب خوشبوئیں مری قوتِ شامہ کو چھیڑ رہی ہیں، مرے خون میں انوکھی حرارت اور تپ گردش کرنے لگی ہے، میری ریڑھ کی ہڈی میں اِک غیر انسانی درجۂ حرارت کی آگ روشن ہوگئی ہے جو دماغ کے خلیوں کا محاصرہ کئے ہے۔ اِس افراتفری کو نظم کیسے دے سکوں گا ؟ میں اِس کا اہل بھی ہوں کہ نہیں ؟ کوئی انسان اِس کا اہل ہے کہ نہیں ؟"

انسان ہی اِس کا اہل ہے۔ افراتفری ہی میں سے ستارے کا جنم ممکن ہے۔ اِسی لئے تو انسان با اختیار بنایا گیا اور اس کو کہا گیا ہے کہ وہ اللّٰہ کے رنگ میں رنگا جائے کیونکہ اِس سے اچھّا رنگ کوئی نہیں ہے۔

اِس افراتفری سے نہ ڈرو۔ قلبِ انسانی اور تخیلِ انسانی کی وسعت کا اندازہ کیا ہی نہیں جا سکتا جب تک آخری اِنسان اِس کائنات میں آ نہیں جاتا۔ جب صلاحیتیں بیدار ہوتی ہیں تو یہی احساس ہوتا ہے کہ اُنفس کے جہاں میں افراتفری مچ گئی ہے۔ یہ اس لئے ہے کہ انسان نے کبھی سوچا ہی نہیں کہ اس کے انفس میں کتنے جہاں مضمر اور مُستتر ہیں۔ انسان کو حقیر نہ جان، اے عزیز! وہ احسن التقویم ہے اور اس کے انفس میں آیات دکھانے کا وعدہ اللّٰہ نے کیا ہے۔

اِن آیات کے طلوع سے نہ گھبرا، یہ مصیبت نہیں، نعمت ہے ; اِس کو قبول کرو، اِس پر غور و فکر کرو ; اِک نظم ضرور وجود میں آئے گا اور اِس کے بعد کئی نظاموں کو

درجہ بدرجہ جنم دیتا چلا جائے گا۔ اَلنفس کی آیات کو کائنات کی آیات کے ساتھ ہم آہنگ کرنا بھی لازم آئے گا کہ اللہ نے صرف کائنات کی تخلیق کو ٹھوس حقیقت قرار دیا ہے! اَلنفس کی تخلیق کو حق قرار نہیں دیا، بلکہ نفس کے پیچھے چلنے والوں کو گمراہ قرار دیا ہے۔ آیاتِ اللہ کا ظہور آفاق میں ہو یا اَلنفسِ انسانی میں اِس کا برحق ہونا لازم اور ناگزیر ہے۔ لہٰذا اُن کو قبول کرنا اور اس کے مطابق عمل پیرا ہونا انسان کی معراج ہے۔"

کمرے سے باہر بے اندازہ روشنی کا شعور دونوں کو ہوا۔ دونوں باہر سبزہ زار پر نکل آئے۔ چودھویں کا چاند بہت تابناک تھا، فضا بالکل شفاف تھی اور ضیاؤں کا نزول ہو رہا تھا۔ چاند کی ضیائیں اُن کے قلب و نظر میں اُتر گئیں اور اُن کے اندر ایک ایسی اطمینان اور سکون رچ گیا اور پھیل گیا۔ نہ جانے وہ کب تک ضیاؤں کے نزول میں نہاتے رہے اور وہ اُن کے رگ و پے میں رچتی رہیں جب اُن کو ہوش آیا تو دِن اپنی سلطنت قائم کر چکا تھا۔ دونوں کی نیند نہ جانے کہاں چلی گئی تھی ــــ اُن کو اس کی حاجت ہی نہ تھی، وہ بالکل تازہ تھے اور اِک توانائی ان کے اندر وندنانی بھرتی تھی۔ اُن کو بھوک لگ رہی تھی، بہت تیز۔

وہ کھانے کے کمرے میں آئے تو کریم ناشتہ لگا رہا تھا۔ شاید اس کو اندازہ تھا کہ اُن کو کس قدر بھوک لگ رہی ہو گی۔ میز طعامِ طیّب سے لدی پھندی تھی۔ دونوں نے دودھ، شہد، مکھن، چھیلے ہوئے بادام، انڈے، توس، سب چٹم کر ڈالے اور اس کے بعد دونوں نے کافی کا ایک ایک بڑا پیالہ پیا۔ کافی نے اتنا مزا کبھی نہ دیا تھا۔ کافی اِک نعمت معلوم دی جس کو اُسی وقت ربِ جلیل نے خاص اُن کے لئے نازل کیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ خوش ہوتے چلے گئے۔ آخر وہ اُٹھ کر ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے۔ کریم کمرے میں داخل ہوا اور شرجیل کو مخاطب ہوا:۔

"میاں! آپ کی امّی آئی ہیں آپ کو لینے کے لئے۔"

وہ فوراً اُٹھا اور باہر چلا گیا اور اپنی والدہ کو ساتھ لئے کمرے میں داخل ہوا۔ شرجیل کی والدہ کو دیکھ متین فوراً اُٹھ کھڑا ہوا، ششدر، حیران، مگر اندر کہیں بہت خوش اور شاداں۔

"متین صاحب، یہ میری امّی ہیں۔ امّی یہ متین صاحب ہیں جو آپ کے ساتھ میڈیکل کالج میں پڑھتے تھے اور آپ کے اکلوتے دوست تھے۔"

"تشریف رکھیئے نا۔۔۔"

کچھ دیر تینوں خاموش بیٹھے رہے۔ شرجیل نے خاموشی کو کلام سے آشنا کیا۔

"مجھے تو آپ دونوں اجازت دیں۔ دو دوستوں کے درمیان رقیب کا کردار ادا کرنا نہیں چاہتا۔ امّی میں کار لئے جا رہا ہوں۔ گھر پہنچتے ہی ڈرائیور اور کار واپس بھیج دوں گا۔ اللہ حافظ۔"

شرجیل چلا گیا تو طاہرہ کے چہرے پر حیا کی سُرخی یکایک پھیل گئی۔ اِس پر قابو پانے کے لئے اس نے لب وَا کئے:۔

"میں ڈاکٹر متین کی ضرور دوست تھی مگر فلسفی متین سے میں آشنا نہیں اگرچہ ڈاکٹر متین کی گفتگو میں فلسفے کی چاشنی ہوا کرتی تھی۔ یہ فلسفے سے طلب کی طرف ہجرت کب کی اور کیوں؟"

"طاہرہ۔۔۔۔"

"میں طاہرہ نہیں اب برجیس ہوں۔ طاہرہ کو میں سرمحی الدّین کے یہاں چھوڑ آئی تھی کہ وہ ڈاکٹر متین ہی کی ہو سکتی تھی۔ جب میں نے نادر سے نکاح کیا تو برجیس کی حیثیت سے۔ میرے بچے بھی مجھے اِسی نام سے جانتے ہیں۔ یہ شرجیل نے نہ جانے کیسے طاہرہ اور متین کو ڈھونڈ نکالا ہے۔"

"اُس نے طاہرہ اور متین ہی کو نہیں ڈھونڈ نکالا بلکہ سرمحی الدّین سے بھی اُس کی

دوستی ہے اور اُن کے ایک پوتے یاسین جاوید سے بھی۔ وہ سرمحی الدین کی خلوت کا بھی شریک بن چکا ہے۔ اُن کے کتب خانے میں اس نے میری تمہاری تصاویر دیکھی ہیں۔ مَیں نہیں کہہ سکتا کہ سرمحی الدین کو اندازہ ہے کہ انہوں نے کس کو اپنی خلوت کا شریک بنایا ہے۔ پچھلے آٹھ ماہ سے وہ "القیام" کا روز کا مہمان ہے۔ شرجیل کو اب معلوم ہے کہ سرمحی الدین سے اُس کا کیا رشتہ ہے۔"

"مجھے کیا معلوم تھا کہ شرجیل کو لینے آؤں گی تو کس آگ سے میرا سامنا ہو جائے گا۔ میرے وہم میں بھی نہ تھا کہ پروفیسر متین سے ملنا پڑے گا اگرچہ یہ مَیں ضرور جانتی تھی کہ میری بیٹی کے ماسٹر کے تھیلس کا راہنما فلسفہ اخلاق کا پروفیسر عبدالمتین ہے اور میرے بیٹے کا ہیرو بھی، پروفیسر متین ہی ہے جو فلسفے اور فلسفۂ اخلاق کا شہر کے ایک کالج میں اُستاد ہے۔

مجھے کیا معلوم کہ اس ڈاکٹر متین کو جس کو میں طاہرہ کے ساتھ چھوڑ آئی تھی وہ میرے بچّوں کے حوالے اور واسطے سے ایک بار پھر مری زندگی میں داخل ہونیوالا ہے۔۔۔۔ مگر مجھے پروفیسر متین قبول ہے، بیٹی اور بیٹے کے حوالے سے، لندن سے یہاں کب آئے؟"

"تمہیں کیسے معلوم ہے کہ مَیں لندن میں تھا؟"

"میں برسوں لندن میں رہی۔ میں نے ایک بار تمہیں اوپیرا ہاؤس میں دیکھا تھا۔"

"تو پھر ملی کیوں نہیں؟"

"یہ حق طاہرہ کو تھا بر جبیں کو نہیں!"

"نادر علی خاں آج کل یہیں ہیں؟"

"نہیں۔ ابھی انگلستان میں ہی ہیں۔ وہاں ہمارا بیٹا کیمبرج میں ہے طبیعیات میں ڈاکٹریٹ کر رہا ہے۔ اسی ماہ پہنچنے والے ہیں۔

مجھے بتول بیٹی نے بتایا ہے کہ تم نے شادی نہیں کی۔ کیوں ؟"

" بتول جمال آپ کی بیٹی ہے ، میں خوش ہوں۔ وہ بہت ہی ذہین اور فطین تو ہے ہی مگر ، میرے لئے یہ بات زیادہ اہم ہے ، وہ اِک حکیم عورت ہے اور خود آگاہ "

" مجھ پر طنز کرنے سے باز نہیں آئے "

واللہ! ایسا ہر گز نہیں ہے۔ یہ حقیقت ہے بتول ایسی ہی ہے جیسی مَیں نے بیان کی ہے۔ مَیں نے زندگی میں ہزاروں انسانوں کو بہت قریب سے ، بے لباس اور بے حجاب دیکھا ہے۔ انسان عاجل ، بے صبرا اور ناشکرا ہے ..... اور خود غرض تو ہے ہی۔ میں ایک ولیہ سے بھی دوستی کے مراحل طے کر چکا ہوں۔ مجھے انسان شناسی کا طویل تجربہ ہے۔ اس لئے بتول جمال کی شخصیت کا پارکھ ہونے کا مجھے حق ہے "

" میرے سوال کا جواب تم گول کر رہے ہو۔ تم نے شادی کیوں نہیں کی ؟ ہند اور انگلستان اور یورپ (تم یوروپ کو یقیناً گئے ہو کہ تم نے فلسفے کی ڈگری وہیں سے لی ہے) میں تمہیں کوئی عورت ایسی نہیں ملی جس کو تم اپنا زوج سمجھ سکتے اور وہ بھی تمہیں زوج قبول کر لیتی ، یہ مَیں ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں"

" تم بجا ٹھیک کہتی ہو۔ انگلستان میں اِک ایسی عورت سے میری بہت گہری دوستی تھی "

" تو پھر شادی کیوں نہ ہوئی "

" وہ سمندر میں ڈوب مری "

" اُس وقت تم کہاں تھے "

" میں جرمنی میں ایک بین الاقوامی طبّی کانگرس میں شرکت کے لئے گیا ہوا تھا"

" کیا وہ تیراک نہ تھی "

" بہت اچھی تیراک تھی "

"تو پھر کیسے ڈوب گئی؟"

"لمبا قصہ ہے کبھی سناؤں گا یہ قصۂ درد۔"

"تم ابھی تک دکھ پجاری، درد شیدائی ہو؟"

"طنز کرتی ہو۔ حساب برابر ہوا۔ میں درد کے مقام اور اہمیت کو پہچانتا ہوں، قبول کرتا ہوں۔ یہی ہے زندگی کا چلن: اِن کو امام کر کے ہی زندگی کا مقصود اور اس کی صحیح آخری منزل، حیاتِ آخرت، حاصل کی جا سکتی ہے، جہاں نہ خوف ہو، اور نہ حزن۔"

"صرف ایک ہی عورت ایسی ملی، یہ میں مان نہیں سکتی۔"

"ایک اور عورت بھی تھی۔ وہ انگلستان سے یہاں آئی تھی۔ انارکسٹ تھی، اُس کے ماں باپ بھی انارکسٹ تھے اور نانا بھی۔ آسمانی باپ اُس کے تعاقب میں تھا۔ اُس سے میری بہت گہری اور پہلو دار دوستی تھی مگر میں اس کو قابلِ قبول نہ تھا کیونکہ وہ اپنے آپ کو میرا ہمسر نہ سمجھ سکی اور مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔ وہ کہتی تھی کہ میرا دین، میری دوستی، میری زوجیت بطور خیرات قبول نہیں کر سکتی۔ اس کے لئے ہر وہ شئے خیرات تھی جو ذاتی محنت سے حاصل نہ کی جائے یا پھر اِستحصال تھی اور اِس سے کوئی علاقہ رکھنا وہ اخلاقی جرم سمجھتی تھی۔"

"وہ آج کل کہاں ہے؟"

"میں نہیں جانتا۔ مجھے اس کی کوئی خبر نہیں۔"

"تم نے اس کو تلاش نہیں کیا؟ تمہیں اُس کو تلاش کرنا چاہیئے تھا کہ ایسے انسان دنیا میں بہت نادر و وحید ہوتے ہیں۔"

"کیا تھا۔ جب انگلستان گیا تو اُس کی والدہ کو تلاش کیا جو انگلستان میں مقیم تھیں۔ وہ کہیں انگلستان کی وسعتوں میں روپوش ہو گئیں تھیں، جیسے اُن کو علم ہو گیا ہو کہ کوئی ان کو

تلاش کرتا ہے اور کیوں۔ اِس تلاش کے دوران پتہ چلا کہ اس نے فرانس سے طب کی تعلیم حاصل کی اور پھر امریکہ چلی گئی۔ میں نے وہاں کی طبّی اور نرسنگ کی مختلف تنظیموں سے خط وکتابت کی تو پتہ چلا کہ وہ یورپ واپس چلی گئی ہے۔ تھک ہار کر اس فراق کو قبول کرلیا۔"

"اب کیا نیّت ہے؟"

"اللہ کی رحمت کا اُمیدوار ہوں کہ وہ زوج دے یا اس کی حاجت سے بے نیاز کردے۔ بہرحال آنکھیں اور کان کھلے رکھتا ہوں۔"

"اب جب ملاقات ہو ہی گئی ہے تو ملتے رہا کرو۔ اِس کے لئے شرجیل اور بتول کا جواز تو ہے ہی۔"

"نہیں اوّل اور آخر جواز تم خود ہو۔ جتنا مَیں نے تم سے سیکھا، جتنے دَر اور دریچے میرے اندر تم نے کھولے، اتنے شاید ہی کسی اور نے کھولے ہوں۔"

"بقول سقراط: میں نے حکمت جاہلوں سے سیکھی۔"

"نہ میں سقراط نہ تم جاہل.... تم نے اپنی بات تو کی ہی نہیں۔ بیوی اور ماں کے علاوہ کیا شغل ہیں؟"

اپنے پرانے ہسپتال میں آنریری فزیشن ہوں۔ ہفتے میں تین روز پرانے ہسپتال جاتی ہوں اور تین راتیں زنانہ ہسپتال میں فرائض انجام دیتی ہوں۔ جب یورپ میں تھی تو فرانس سے M.D کرلیا تھا اور وہیں میڈیکل انسٹی ٹیوٹ سے فیلوشپ کرلی تھی۔ جب جنگِ عظیم دوئم کا آغاز ہوا تو اپنی خدمات حکومتِ برطانیہ کے سپرد کردیں۔ بیٹی اور ایک بیٹے کو اُن کی پھوپھی کے پاس ہندوستان بھیج دیا تاکہ وہ اپنی تعلیم اپنے دیس مَیں مکمل کریں اور اس کے ماحول سے بخوبی آشنا ہوجائیں۔ پچھلے سال مَیں نے کوشش کرکے اپنی خدمات ہندوستان منتقل کرالیں۔ اب یہیں قیام

کا ارادہ ہے کہ اسی سرزمین کے پھلنے پھولنے سے اپنی کھیتی بھی سرسبز و شاداب ہوگی۔ یورپ میں ہم اجنبی تھے، اجنبی رہے یا پھر یوروپ کے نقّال۔"

" نادر علی خان کیا کرتے ہیں؟ صنفِ نازک سے اُن کے تعلقات کیسے ہیں؟"

صنفِ نازک سے اب ان کے رشتے تکریم میں محیط ہیں۔ یہ ایک انگریز لارڈ کی بیٹی کی دین ہے۔ اُس کی محبّت نادر اور مجھ پر اور ہمارے بچوں پر اس طرح ٹوٹ کر برسی کہ گماں ہوا کہ بہا کر لے جائے گی مگر اس کی بوند بوند ہمارے دل وجان میں اس طرح رچ بس گئی کہ ہم سب اپنی اپنی ذات کی تکریم سے پہلی بار ہم کنار ہوئے۔

پھر اُس کی ماں نے پیرس میں دو لیڈی ڈاکٹروں سے تعارف کرایا۔ ایک نے ہم کو دوستی کے جہاں میں اور دوسری نے محبت کے جہاں میں ہمیں سرفراز کیا۔ خود دوسری کے لئے یہ محبّت صلیب بنی اور وہ بے خطر صلیب پر چڑھ گئی اور وہاں کسی کو نہ پکارا۔ اُس کی محبّت نے نادر کو دَرد و آلام، مصائب و نوائب اور آفات سے بھرپور آشنائی کرائی۔ اُس سے نادر کی ایک بیٹی ہے جو مجھے اپنی ماں جانتی ہے اور بھرپور پیار کرتی ہے۔ فی الحال وہ پیرس میں اپنی پرنانی کے پاس رہتی ہے کہ اس کی اولاد میں سے وہی باقی رہ گئی ہے۔

دَرد آشنا تو اب میں بھی ہوں مگر عطائی ہوں۔ تمہارے لئے شاید یہ کوئی قابلِ قبول سفارش نہ ہو۔"

اتنے میں کریم ایک تعارفی کارڈ لے کر آگیا۔

"یہ کارڈ لے کر کون آیا ہے؟"

"سر خود آئے ہیں۔ میں نے اُن کو کتب خانے میں بٹھایا ہے اور بتایا ہے کہ آپ کے پاس مہمان ہیں۔ وہ انتظار کریں گے۔"

"برجیس! سر محی الدین آئے ہیں۔ اِنکار نہ کرنا۔ آؤ!"

"آداب عرض ہے ۔ یہ طاہرہ، کہ اب بر جبیں ہے، آج ہی اچانک مل گئی ہے۔ اس کا بیٹا شرجیل احمد رات بھر میرا مہمان رہا۔ صبح جب یہ اُس کو لینے کے لئے آئی تو اُس نے اِس کو بتائے بغیر کہ میں ہی اس کا پُرانا دوست ڈاکٹر متین ہوں، مجھ سے ملاقات کے لئے، اصرار کر کے، لے آیا۔"

"کہاں ہے یہ شرجیل۔ وہ میرے پوتے کا دوست ہے۔ اس سے ملنے آتا ہے۔ ایک دن اِس سے اِک طویل ملاقات رہی مگر اس کے بعد وہ مجھ سے ملنے نہیں آیا، اگرچہ جب کبھی آمنا سامنا ہو جائے تو اپنوں کی طرح ملتا ہے۔ میں اُس سے خوش ہوں۔"

ہم دونوں رات بھر موسیقی سنتے رہے۔ پھر صبح تک باتیں کرتے رہے۔ ناشتہ اِکٹھے کیا۔ طاہرہ اُس کو لینے آگئی۔ ہم دونوں کو رُو برو کر کے وہ گھر چلا گیا کہ محفلِ دوستاں میں رقیب کا کیا مقام ہے۔"

"اللہ بہت بڑا کارساز ہے۔ اُس نے شرجیل سے ملا دیا۔ اُس سے پتہ چلا کہ ڈاکٹر متین اور تم ہم شکل ہو۔ بہت دن سے اِرادہ کر رہا تھا کہ تم سے اچانک مِلنے آؤں۔ آج اِرادہ عمل میں ڈھل گیا تو چلا آیا۔ اللہ نے تم دونوں سے ملاقات کرا دی۔ میں طاہرہ سے آمنا سامنا قبول کرتا ہوں، اور اُس کے عواقب بھی۔ پچیس برس کا فراق کافی ہے۔ اب قوتِ برداشت کم ہے۔ دُکھ بہت بڑا اُستاد ہے! جو سیکھنا نہیں چاہتا تھا وہ اِس نے سکھا دیا ہے ۔۔۔۔"

"اب گھر کب آؤ گی؟"

"نادر اور میرا بڑا بیٹا ہفتے عشرے تک انگلستان سے آنے والے ہیں ہم سب حاضر ہوں گے۔ شرجیل آپ کے یہاں مہینوں سے آتا جاتا ہے، مجھے متین نے بتایا ہے۔ میری ایک بیٹی ہے جو Botany میں ماسٹر کر رہی ہے متین اس کے تھیسس

کے لئے اُس کا ایک راہنما ہے۔"

"متین میاں، تمہیں تو جوابی ملاقات کے لئے آنے میں کسی کا انتظار نہیں۔"

"بالکل نہیں۔ آج تو آپ دونوں میرے مہمان رہیں دن بھر جشنِ ملاقات رہے آج رات تلک۔"

"میرا گناہ معاف کردیں کہ اب میں بیٹی ہی نہیں ماں بھی ہوں۔ میں نے اولاد کو ننھیال کی شفقت اور محبت سے محروم رکھا۔"

"بیس برس ہوئے تمہیں معاف کئے۔ شاید اُسی کا صلہ آج اللہ کی رحمت سے مل گیا ہے۔ اللہ کے حضور سراپا سپاس گذار ہوں۔ اس کی رحمت کے لئے۔"

۴

"آہاہا! آج اللہ کی برکتوں کا یہ یکایک نزول۔ اللہ تیرا شکر ہے، تو ہی ایسی برکتوں، رحمتوں کا نزول کرسکتا ہے!"

"بابا آپ کیسے ہیں؟"

"بیٹا، اُداس رہا بہت۔ اب نہیں رہوں گا۔ اس گھر میں پھر سے بہار آئی ہے۔ پُرانے پھول کھِل اٹھے ہیں، نئے پھول لگیں گے اس باغ میں۔ اب پھل آئے گا اس گھر کے درختوں پر انوکھا اور سُہانا۔"

"مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ شاعر بھی ہیں۔ پہلے تو ایسی بات آپ نے کبھی نہ کی تھی۔"

"بیٹی، پہلے تم میرے پاس تھیں۔ شعر کی ضرورت ہی نہ تھی۔ پھلوں، پھولوں کی آبیاری اور نگرانی سے دِل بہلا رہتا تھا۔ تم گئیں تو اُداسی میرے پاس آئی اور تنہائی۔ دونوں نے مل کر شاعر بنا دیا۔ واقعی۔ سناؤں گا تمہیں اپنے شعر۔ ڈاکٹر صاحب۔ آپ

برسوں سے اس شہر میں ہیں اور مجھے کبھی یاد نہیں کیا، خبر نہیں پوچھی۔"

"یہ اب ڈاکٹر نہیں گیانی ہے۔ طالب علموں کو گیان دھیان سکھاتے ہیں۔"

"وید گیانی نہ ہو تو محض پنساری ہے۔ میں صاحب کو خبر کرتا ہوں۔"

"اُن سے ملاقات ہو چکی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی پر۔"

"میں ہی پھسڈی رہ گیا۔"

"یہ ڈاکٹر صاحب اب شرجیل کے پیر و مرشد ہیں۔ یہ ان کے یہاں ایک رات مہمان رہ گیا تو صبح میں اس کو لینے گئی تو اس نے ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کرادی۔ ان سے ملنے ابو چلے آئے تو ان سے ملاقات ہو گئی۔"

"اللہ کے کام نیارے ہیں۔ وہی کرم کرے تو بات بنتی ہے۔ شرجیل میاں آپ روز یہاں آتے ہیں، مہینوں سے، مگر اشارہ تک نہیں کیا آپ نے کہ آپ کا اس گھر سے اتنا گہرا رشتہ ہے۔ اس عمر میں اپنے آپ پر اتنا ضبط۔"

"بابا مجھے بھی چند ہفتے پہلے تک معلوم نہیں تھا۔ اُس دن جب یاسمین جاوید پھوپھی کے یہاں گیا تھا تو سر صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ وہ اپنے کتب خانے میں لے گئے۔ چائے پلائی۔ باتیں کیں۔ مگر تب بھی مجھے پتہ نہ چلا۔ اُسی کمرے میں امّی اور ڈاکٹر صاحب کی تصویریں تھیں۔ ڈاکٹر صاحب کو میں پہچان لیا۔ پھر مجھے پتہ چل گیا کہ دونوں میڈیکل میں اکٹھے پڑھتے تھے، دونوں کی گہری دوستی تھی اور پھر یہ کہ طاہرہ محی الدین میری والدہ ہیں۔ امّی اور سر صاحب کے رشتے کی بات مجھے اُس رات سے چند دن پہلے پتہ چلی جو میں نے متین صاحب کے یہاں گزاری۔ اُس کے بعد یہ طے ہو گیا کہ ہم سب نانا ابو سے ملنے آئیں گے۔ لہٰذا آپ کو بتانا ضروری نہ سمجھا۔ اچانک ملاقات میں جو مزا ہے وہ متوقع ملاقات میں کہاں ۔۔۔۔ اب تو آپ مجھ سے ناراض نہیں ہیں؟"

" ناراض اور میں۔ میں تو تمہاری امّی کے بچپن کا دوست ہوں۔ میں نے ہی تمہاری امّی کو ان سبزہ زاروں پر آ متوں رات رات بھر سرگرداں دیکھا اور مَیں نے ہی اُس کو اپنے گھر کے دروازے سے نکل کر اِس گھر سے رخصت ہوتے دیکھا۔"

"مجھے الوداع کیوں نہ کہی۔"

"مَیں نے کبھی تم سے گفتگو کا آغاز نہیں کیا، ہمیشہ تمہاری بات کا جواب ہی دیا۔ آخری بار اُس قاعدے کو کیسے توڑ دیتا.... اجنبی مہمانوں سے تو تعارف نہیں کرایا، بیٹا نے۔"

" اوہ! بھول ہی گئی کہ پچیس برس کے بعد مِل رہے ہیں۔ یہ امجد جمیل ہے، میرا سب سے بڑا بیٹا۔ یہ کائنات کے ذرّوں کا وِید ہے۔ اور یہ بتول جمال ہے، میری اکلوتی بیٹی۔ یہ پودوں اور درختوں کی وِید ہے۔ سولہویں جماعت میں پڑھتی ہے اور ڈاکٹر متین کی راہنمائی میں کام کر رہی ہے.... اب اجازت دیں۔ ابّو امی سے مل لیں۔ میں جانے سے پہلے امّاں سے ملنے کے لئے آؤں گی۔ میرا سلام کہیئے اُنہیں۔"

" میں بھی کتنا کٹھور اور خود غرض ہوں کہ ماں بیٹی اور باپ بیٹی کی ملاقات میں حائل ہو گیا۔ معافی چاہتا ہوں۔"

"آپ کا حق فائق ہے۔ جتنے گھنٹے میں نے آپ کے ساتھ گزارے اتنے تو شاید ابّو امّی دونوں کے ساتھ بھی نہیں گزارے اور وہ لمحے کتنے اچھے اور پاک تھے، پھولوں کی بُوا کی طرح۔"

" مجھے اطلاع دی ہوتی۔ میں اپنوں کو دروازے پر خوش آمدید کہتا، اُن کے قدموں پر تیل ٹپکاتا جن کو میں آج پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔"

" مجھ سے آپ ابھی تک ناراض ہیں۔ مجھے شامل نہیں کیا اپنوں میں۔"

" جب تمہیں طاہرہ نے قبول کر لیا، بر جبیں بن کر ہی سہی، اور میں نے بیس برس ہوئے طاہرہ کو معاف کر دیا، تو پھر تم سے ناراضگی کا کوئی جواز ہی نہیں رہا۔"

" آپ ہمارے یہاں کب آرہے ہیں "۔

" اب تو آتے جاتے رہیں گے۔ وقت طے کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف ایک درخواست پیشگی قبولیت بخشو تو کروں "۔

" ابو آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ حکم کریں، تعمیل ہو گی "۔

" بتول جمال کو مجھے دے دو، یہ رہے میرے پاس تو ۲۵ سال کا فراق بھلانے میں آسانی ہو جائے "۔

"میں نہ رہوں آپ کے پاس "۔

" نہیں۔ ماں کا مقام اپنی اولاد کے پاس، بیوی کا مقام خاوند کے پاس "۔

" نانا ابو! میں رہوں گی آپ کے پاس "۔

" شکریہ، بیٹی! آج سے آپ میری بیٹی ہیں۔ دل میں اِک خلا تھا وہ آج بھر پور ہوا۔ رب العالمین کا شکر ہے۔ وہ اپنے وعدے پورے کرتا ہے۔ ہر تنگی کے بعد فراخی ہے۔ بیٹی، اب تم طاہرہ بتول جمال ہو میرے لئے۔

" متین میاں! تمہارے فلسفے اور فلسفۂ اخلاق کا میں کیا کروں۔ طب کا تو میں کچھ کر سکتا تھا۔ طبیب کا فلسفہ پہلے بھی میرے کام آیا۔ اب فلسفی طبیب بن جاؤں تو شاید تمہارا فلسفہ میرے بڑھاپے میں کام آجائے۔ میں اب اپنی موت خود کمانا چاہتا ہوں "۔

" ابو! ملاپ کے وقت موت کا ذکر لے بیٹھے۔ کیا ضرور تھا "۔

" برجیس بیٹی انسان میں لمحہ بہ لمحہ کچھ نہ کچھ مرتا رہتا ہے اور کچھ نہ کچھ نیا پیدا ہوتا رہتا ہے۔ انسان کی مصیبت یہ ہے کہ وہ یہ جانتا نہیں اور اگر جانتا ہے تو قبول نہیں کرتا۔ میں جانتا ہوں اور قبول بھی کرتا ہوں اور اب چاہتا ہوں یہ علم مرا امام ہو۔ موت حیاتِ ارضی کی آخری منزل ہے اور حیاتِ آخر کی دہلیز۔ میں اِس دہلیز کے

اُس پار پورے ہوش اور خوشی سے گذرنا چاہتا ہوں۔ موت حیات کی زوج ہے۔ دونوں کا نکاح کئے بغیر حیاتِ ابدی ممکن نہیں۔ اگر اس ارضی زندگی میں اِس نکاح کے مراحل طے کرلئے جائیں تو دُکھ اور سُکھ، کرب اور انبساط تخلیقِ مسلسل کی صفات اور اس کے استعارے بن جاتے ہیں۔

"کاش یہ بات کوئی جوانی میں بتا دیتا، سکھا دیتا۔ یہ بات متین سے اُس وقت پتہ چلی جب برجیس بیٹی، نادر علی! تم سے نکاح کر لینے کا فیصلہ کرچکی تھی اور متین اُس کا سفارشی بن کر میرے پاس آیا تھا۔ تب سے دردِ آشنائی کا سفر شروع ہوا۔ کوئی پانچ سال لگے اس کو قبول کرتے۔ بیٹی تمہارا اور متین کا ممنون ہوں کہ موت کی طرف میری ہجرت کو تم دونوں نے بامعنی بنا دیا۔

ہم سب اس مقام پر پہنچ لئے ہیں جہاں اِک جشن منانا لازم ہے۔ یہ جشن معراج کوٹ میں منایا جائے گا۔ ہمارے خاندان نے چند صدیاں پہلے وہاں سے اپنا سفر شروع کیا تھا۔ ایسا نہ بھی ہوتا تو بھی میں چاہتا کہ نوجوان دیہات کی زندگی سے آشنا ہو جائیں جہاں کائنات اپنے سارے روپ دکھاتی ہے، بلا حجاب۔ جہاں سے آدم نے انسانیت کے سفر کا آغاز کیا تھا۔ اُس وقت وہ فطرت سے بہت قریب تھا۔ اور فطرت کا خالق اپنی پوری شان سے اُس کے سفر میں شریک تھا۔ مگر اب انسان اُس کے بغیر ایک نیا سفر شروع کر چکا ہے جس کا انجام تباہی کے سوا کچھ ممکن نہیں۔ امجد جمیل تم اس بات کو آسانی سے سمجھ سکو گے اگر تم چند ہفتے (اگر ماہ نہیں) معراج کوٹ میں رہ لئے۔ تم طبعیات کے عالم ہو اور دیہات میں طبعی عوامل کی صورت گری فراواں اور بے حجاب ہوتی ہے۔ اور تم، بتول جمال، حیات اور موت کو پودوں اور درختوں، پانی اور ارض کے رشتوں میں ہم کنار دیکھ سکو گی اور دُکھ اور درد اور تخلیق کے رشتوں کو سمجھ سکو گی۔

اس کے بعد نادر علی! تمہارے یہاں کوٹ عبداللہ چلیں گے اور قیام کریں گے۔
پہلے باقی اہلِ خانہ سے مل لیں، کچھ دیر سستا لیں تو پھر درد آشنائی کے نئے سفر
پر نکلیں گے۔ آمین!

حصہ دوم

مصائب و آفات کو امام کیا

خزاں جوان تھی۔ فضا شفاف تھی۔ ارض پر گلال کھیل رہا تھا۔ موسم میں خنکی آچلی تھی۔ شمال اور مغرب کے پہاڑوں کے دامن میں میلوں پھیلے کھیتوں کے درمیان ایک پگڈنڈی پر دو ادھیڑ عمر چلے جا رہے تھے۔ دونوں اپنے ماحول سے بھرپور لطف اندوز ہو رہے تھے، جیسے ارض پر پہلی بار خزاں آئی ہو اور حیاتِ انسانی نے پہلی بار شعور کی، حیرت کی آنکھ وا کی ہو۔

چلتے چلتے اس پگڈنڈی سے اینٹوں سے چنی ہوئی اِک روش پر جا نکلے اور وہ روش تاکستان میں جا نکلی، جہاں دُور دُور تک لکڑی کی ٹٹیوں پر سبز، سنہرے، سیاہ، سُرخ انگوروں کے خوشے دھوپ میں محوِ خواب تھے، اُن کے وجود سے بے خبر
"میں آپ کو یہاں اس لئے لے آیا ہوں کہ اس تاک زار نے مجھے ننھی ننھی خوشیوں اور ننھے دُکھوں میں سرشار اور سرگرداں پھرتے دیکھا اور اپنے آپ سے ہم کلام ہوتے سُنا، اور اِس زمین سے اُس کا سینہ چیر کر نکلنے والی ہر کونپل، کونپل سے بننے والے ہر پھول اور درخت نے سر ہلا، ہاتھ ہلا ہلا کر مجھے پہچان کر سہارا دیا، خوشیوں اور دُکھوں کو سہہ جانے کا سبق دیا اور میری خود کلامی کو سُن کر اپنے اندر چھپا لیا۔
آپ کو میں اپنی زندگی کے اُس حصے کی داستان سُنانا چاہتا ہوں جب ہم چلیں

بیوی بن چکی تھی۔ اِس میں بپتا، مصائب اور آفات کے رنگ مسرتِ بے پایاں اور فرحتِ بے نہایت کے رنگوں کے ساتھ اِس طرح گھلے ملے ہیں کہ اُن کو الگ الگ، جُدا جُدا کر کے دیکھنا محال ہی نہیں، ناممکن ہے۔ آپ کو اس لئے سُنانا چاہتا ہوں کہ آپ اس وقت بھی دُکھ شناسا اور درد آشنا اور اُن کے مقصود اور تفاعل سے واقف تھے جب آپ طاہرہ کے اکلوتے دوست اور ہم راز تھے اور اس کے گھر والوں، اُس کے جاری پُشتی نوکروں اور ملازموں کے منظورِ نظر تھے اور طاہرہ آپ پر راحتیں، مُسرتیں، آسائشیں نچھاور کرتی تھی اور آپ سے بھرپور محبّت کرتی تھی اور آپ نے اِس کے باوجود اُس سے نکاح کرنے سے انکار کر دیا کہ وہ درد آشنا نہ تھی اور دَرد آشنائی کے سفر پر نکلنے کے لئے راضی نہ تھی۔ اس کو صلیب کا سفر جانی تھی۔

میں اپنی شخصیت کے کسی عمیق اور نہاں گوشے میں اِس داستان کی معنویت سے بھرپور طور پر آگاہ ضرور ہوں اور اس کو قبول بھی کرتا ہوں۔ مگر میرا شعور، میرا ذہن، میرا علم، (ہاں! میرا علم!) اس معنویت کا احاطہ نہیں کر پائے۔ شاید آپ ہی کو سُناتے ہوئے) اِس کی معنویت میرے شعور، میرے ذہن اور میرے علم پر نازل ہو جائے کہ اللہ نے آلام و مصائب و آفات کے معنی آپ پر برسوں پہلے نازل کر دیئے تھے۔

جب برجیس سے میرا نکاح ہو چکا اور ہم دونوں میاں بیوی کی زندگی سے آشنا ہو لئے تو ہم دونوں نے فیصلہ کیا کہ ہم ہندوستان سے انگلستان چلے جائیں تاکہ سَر محی الدین اور اُن کے خاندان کو ہمارے وجود سے مزید دُکھ نہ پہنچے۔ جب ہم مصر پہنچے تو معلوم ہوا کہ انگلستان پہنچنا ممکن نہیں کہ جرمن جہاز برٹش مسافر جہازوں پر حملے کرنے لگے ہیں۔ لہٰذا ہمیں مشورہ دیا گیا کہ ہم مصر ہی میں قیام کریں جب تک بحری راستے محفوظ نہیں ہو جاتے۔ لہٰذا ہم نے قاہرہ میں ایک مکان کرایے پر لیا اور انتظار کرنے لگے۔ جلد ہی معلوم ہو گیا کہ یہ انتظار مہینوں تک طول کھینچے گا۔ لہٰذا طے کیا کہ

اس عرصے میں عربی سیکھ لی جائے۔ لہٰذا ایک اہلِ زبان کی خدمات حاصل کیں اور
عربی زبان سیکھنی شروع کی اور ساتھ قاہرہ اور اس کے گردونواح میں اہم تاریخی اور
علمی مقامات کی سیر شروع کی۔ وہاں آٹھ ماہ تک قیام رہا۔ انگلستان پہنچ کر لندن
میں اک مکان کرائے پر لیا اور نئی زندگی کا آغاز کیا۔

برجیس نے طبیبوں اور طبی محققین سے رابطے قائم کئے اور ایسے لوگوں کا اکثر
ہمارے گھر میں آنا جانا رہنے لگا۔ ان محفلوں میں میرا دم گھٹتا تو میں اپنے آپ کو ان
خاندانوں کے بوڑھے انگریزوں کی محفلوں میں شطرنج، تاش اور گفتگو طرازی کے کھیل کھیلنے
میں مصروف رکھنے لگا جن کے لئے ہندوستان سے انگریز دوستوں اور مہربانوں سے تعارفی
خط لے آیا تھا۔ جب تھک جاتا تو گھر سونے کے لئے چلا آتا۔ برجیس ہمیشہ مجھے
خوش آمدید کہتی، کسی پر تکلف کھانے، میٹھی یا چٹ پٹی شے سے تواضع کرتی۔ گرم
پانی ہمیشہ تیار ملتا۔ منہ ہاتھ پاؤں، دھوکر یا کبھی نہا کر، بستر پر دراز ہوتے ہی
سو جاتا۔ صبح اٹھتا تو احساسِ گناہ جاگتا کہ برجیس کو اس کے خاندان سے جدا کرکے اس
اجنبی دیس میں لے آیا ہوں اور اکثر وقت اس کے ساتھ نہیں گذارتا، بلکہ اس
سے دور اس کے علم سے ماورا گذارتا ہوں، یہ کیسا ساتھ ہے جس کے لئے وہ اپنے
ماں باپ، بہن بھائی، سب کچھ چھوڑ آئی ہے۔ جب یہ احساسِ گناہ شدید ہوا
تو میں نے طے کیا کہ میں وہ تمام علوم اور ذوق اپناؤں گا جو برجیس کے بس میں
آچکے ہیں اور ان کے علاوہ بھی کچھ اور۔ لہٰذا میں نے صبح کا وقت اس کے ساتھ
گذارنا شروع کیا اور دوپہر کا کھانا کھا کر گھر سے نکل برٹش میوزیم کے کتب خانے
میں جا بیٹھتا۔ چند ماہ لگے کتابوں سے دوستی کرنے میں۔ اس کے بعد منزلیں آسانی
سے گذرنے لگیں۔ عربی کے علم کو پختہ کرنے کے لئے مشرقی علوم کے اسکول میں داخلہ
لے لیا۔ کوشش کرتا کہ برجیس کو رات کے وقت میرا انتظار نہ کرنا پڑے۔ جب

علوم میں کچھ شُدبُد ہوئی تو برجیس کے دوستوں کی محفلوں میں شریک ہونے لگا۔ پھر اپنے علمی دوستوں کو گھر بُلانے لگا۔ ساتھ ساتھ برجیس کو انگریز معاشرے کے اسرار سے آشنا کرانا شروع کیا۔

ایک دن مجھے یکایک احساس ہوا کہ برجیس ماں بننے والی ہے۔ مَیں نے اپنی تمام غیر علمی مصروفیات کو کم کردیا اور زیادہ سے زیادہ وقت اُس کے ساتھ گذارنے لگا، اس پر اس نے اچنبھے کا، حیرت کا، اظہار قطعاً نہ کیا، جیسے اُس کو معلوم تھا کہ مجھ پر کیا بیت رہی ہے۔ مَیں نے کوشش کرکے آخری دو ہفتوں کا اکثر وقت اُس کے پاس گذارا۔ اُس وقت بھی میں اُس کے پاس تھا جب وہ دردِزہ میں کراہ رہی تھی۔ اس کا دایاں ہاتھ میرے ہاتھوں میں تھا اور اُس کی نظریں کبھی میرے ہاتھوں پر، کبھی میرے چہرے پر، کبھی میری نظروں کے ساتھ محوِ سفر۔ اُس کا دردِزہ تیرہ چودہ گھنٹے جاری رہا۔ مَیں نے اُس کو کراہتے سُنا، مَیں نے اُس کو تڑپتے دیکھا، اس کے کراہنے، تڑپنے کے درمیان، کبھی کبھی ایک طویل لمحے کے لئے، اُس کے چہرے پر اِک مستی کی کیفیت کو عروج کرتے اور چھا جاتے دیکھا گیا۔ جو اُس کے چہرے کے حُسن اور اُس پر ہویدا کرب کو اِک ایسے امتزاج میں قلبِ ہیئت کردیتی جو فوق الانسان لگتا۔ مَیں نہ تو اس کے ساتھ کراہ سکتا تھا اور نہ تڑپ سکتا تھا، مگر مَیں دل و جان سے اُس کے ساتھ رہا۔ اور جو کچھ اس پر بیت رہا تھا اُس کو اپنے آپ پر بتا لیا۔

جب اس نے بیٹے کو جنم دیا تو بیٹے کے چہرے پر پہلی نظر میں نے ہی ڈالی۔ میں نے ہی پاک وصاف کئے جانے کے بعد اُس کے کانوں میں اذان دی۔ اُس کی صدا برجیس کے کانوں تک پہنچی تو اُس کی آنکھوں میں آنسو تیر گئے اور اُس کے رخساروں پر چھلک آئے۔ اُس کی آنکھوں میں خوشی تھی بے پایاں، سُرخوشی تھی بے نہایت۔ وہ دردِزہ کی کٹھن تکلیف کو لمحوں کے لئے بھول گئی۔ جب وہ سو گئی تو میں اُس سے

جدا ہوا۔ کچھ کھایا اور سوگیا۔ چند گھنٹے کے بعد اُٹھا تو تازہ دم تھا اور اِک نیا نادر علی خان تھا۔ میں برجیس کے پاس گیا اور دیر تک اس سے باتیں کرتا رہا۔ میں نے اُس کے ساتھ چند دن اِسی طرح گفتگو طرازی کرتے اور اُس کی خاموشی کے ساتھ ہم کنار ہوتے ہوئے گذارے۔ مہینوں بعد برجیس نے مجھے بتایا کہ اتنی اچھی گفتگو میں نے کبھی نہ کی تھی اور اِس گفتگو نے اُس کو نئے نادر علی سے آشنا کرایا، جس کو اپنانے میں اُس کو ہچکچاہٹ نہ ہوئی جو اُس کے ذوق وشوق اور علم وہنر کا بہت ہی قریبی ساتھی تھا۔ اس دن میں نے اس کو بتایا کہ میں اُس سے غیر حاضر کیا کیا کچھ کرتا رہا۔ اُس نے اِس کو اس طرح سُنا جیسے کہ اُس کو عرصے سے معلوم ہو اور اُس نے اس کو قبول کرلیا ہو۔

اِس کے بعد ہماری زندگی کے اکثر لمحات ایک دوسرے کے ساتھ گذرتے۔ وہ اکثر اتنی دیر کے لئے میرے ساتھ برٹش میوزیم، مشرقی زبانوں کے سکول، کی لائبریری میں رہتی جتنی دیر امجد جمیل کے سونے کا وقت ہوتا۔ جب اُس کو دودھ کی حاجت ہوتی تو وہ اس کے پاس موجود ہوتی۔

پانچ سال میں ہمارے یہاں تین بچے ہوئے۔ میں ہر بچے کی پیدائش سے پہلے دردِ زہ کے تمام مراحل میں برجیس کے پاس بیٹھا گفتگو طرازی کیا کرتا۔ کبھی کبھی اُس کے لبوں پر مُسکراہٹ رقصاں کرنے میں کامیاب ہوجاتا۔ کراہنے اور تڑپنے کے طویل عرصے میں چند لمحوں کی مسکراہٹ عجیب بہار دکھاتی۔ یہ مُسکراہٹ نہ صرف اُس کے لبوں پر رقصاں ہوجاتی بلکہ اُس کی آنکھوں میں بھی رقصاں ہوجاتی اور نور اور رنگ بکھیرتی چلی جاتی اور کراہنے اور تڑپنے پر حاوی ہوجاتی۔ یہ درد اور انبساط کے رنگوں کا باہمی گھال میل مجھے کبھی نہیں بھولا اور میں نے اِس کو ہمیشہ اپنی سب سے گراں مایہ تخلیق جانا۔

شرجیل احمد کی پیدائش کے کچھ عرصہ بعد مشرقی زبانوں کے اسکول میں ایک لڑکی نے داخلہ لیا اور ایک دن لائبریری میں مجھ سے اپنا تعارف یہ کہہ کر کرایا :۔

"مجھے بتایا گیا ہے کہ عربی میں آپ سے بہتر اُستاد مجھے میسر نہیں آسکتا۔ کیا آپ مجھے اِس زبان پر عبور حاصل کرنے میں مدد دیں گے۔ یوں تو عربی بول چال میں مجھے کافی مہارت ہے۔ جب بھی شمالی افریقہ کے عرب ممالک میں جاتی ہوں تو عربی میں ہی کلام کرتی ہوں مگر کلاسیکی عربی کی علمی اور ادبی کتب میرے پلّے نہیں پڑتیں۔ اس لئے داخلہ لیا ہے۔ آپ میری مدد کریں۔"

"مَیں نے اپنی ہیچ مدانی کا اظہار کیا اور اُس کا ساتھ دینے کا وعدہ کرلیا۔ اِدھر اُدھر سے میرے کانوں میں پڑنا شروع ہوا کہ وہ کون ہے۔ وہ لارڈ بورن متھ کی بیٹی تھی۔ اُن کا خاندان انگلستان کے جدّی زرعی رؤسا خاندانوں میں بہت ممتاز تھا۔ اُس کا خاندان صدیوں پُرانا خانوادہ تھا جس میں ڈیوک، مارکوئیس، لارڈ، اَرل لاتعداد تھے اور اُس کے خاندان کے رشتے انگلستان کے قدیمی خاندان سے متھ در متھ تھے۔ اُس کے رشتے شاہی خاندان سے بھی تھے۔ وہ شاہی خاندان کی دعوتوں میں بارہا شریک ہوچکی تھی۔ اِس قسم کی اطلاعات نے میرے اندر تحریک پیدا کی کہ میں اُس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گذارہ کروں۔ چونکہ میں برجیس کے ساتھ اپنا وقت کم نہ کرسکتا تھا اِس لئے میں نے اُس کا تعارف برجیس سے بھی کرادیا اور اِس کے ساتھ اُس کو بتادیا کہ برجیس بھی اُس کی راہنمائی عربی ادب میں کرسکتی ہے۔

رفتہ رفتہ اس کے تعلّقات برجیس سے، میرے بچوں سے، میرے ملازموں سے، بہت گہرے ہوتے چلے گئے۔ کبھی کبھی میرے بچّے اُس کو رات کو روک لیتے کہ وہ رات اُن کے ہمراہ گزارے۔ وہ اپنے گھر اطلاع کردیتی، اور میرے بچّوں کے کمرے میں اُن کو

کہانیاں، گیت سُناتے سُناتے اُن کے ساتھ ہی سو جاتی۔ جب وہ اُن کے ساتھ رہ جاتی تو وہ اگلی صبح بہت خوش اور نازاں ہوتے کہ وہ اُن کے ساتھ سوئی تھی۔ وہ اُس کے جسم سے نکلنے والی خوشبو کا اکثر ذکر کرتے رہتے اور اُس کے بوسوں کی مٹھاس اور اُن سے ہونے والی راحت کا ذکر اپنی امّی سے ضرور کرتے اور یہ ذکر کرتے ہوئے اُن کی آنکھوں میں ایسی چمک آجاتی کہ برجیس کبھی کبھی اِس کا مجھ سے ذکر کرتے ہوئے کانپ جاتی اور عجیب حیرت اور لجالت سے مجھے تکتی۔ اُس وقت تو مجھے اِس کی سمجھ نہ آئی کہ اِس کا جواز کیا ہے۔

لیکن جب پٹیشیا (Petitia) نے مجھ سے اظہارِ محبّت کیا تو میری سمجھ میں آگیا کہ برجیس کی آنکھوں میں چھلکتی ہوئی حیرت اور لجالت کے کیا معنی تھے۔ اُس کو شدید احساس تھا کہ ایک دن پٹیشیا یقیناً محبّت کا اظہار کرے گی اور جب کرے گی تو کیا ہوگا۔

اِس اظہارِ محبّت کے بعد اس کی عنایات ہمارے خاندان کے افراد پر اس قدر بڑھ گئیں کہ بعض دفعہ اُس کے تحائف قبول کرتے ہوئے شرمندگی محسوس ہوتی کہ شاید ہم اُس کا استحصال کر رہے ہیں، اُس کو بُدّو بنا رہے ہیں۔ مگر اس کے تحائف اس کے پیار، اِس کی عنایات سے انکار کرنے کی جرأت کبھی نہ ہوئی کیونکہ یہ سب کچھ بہت گہرے، تہہ در تہہ خلوص میں لپٹا ہوا ہوتا۔

امجد جمیل کی چھٹی سالگرہ پر اُس نے اُس کو پنسلیں اور قلم رکھنے کے لئے ایک نہایت ہی خوبصورت لکڑی کا منقّش بکس دیا جس میں موتی جڑے تھے۔ امجد جمیل نے لینے کو تو بکس لے لیا مگر تنہائی کے اِک لمحے میں اُس نے یہ کہہ کر لوٹا دیا۔

"موتی بچّوں کو نہیں خوبصورت عورتوں کو دیتے ہیں۔ مَیں خوبصورت بچّہ بھی نہیں، اگرچہ ugly duckling بھی نہیں۔ مَیں اتنا قیمتی تحفہ قبول نہیں کر سکتا۔

خالہ! یہ تحفہ آپ اپنے محبوب کو دینا۔ وہی اس کا حق دار ہوگا۔ ہم سب سے آپ بہت پیار کرتی ہیں۔ یہی بہت کافی ہے۔ آپ ہماری عادتیں نہ بگاڑیں۔ ایسی محبت کہاں ملے گی؟"

"اُس کی بات سُن کر وہ ششدر رہ گئی۔ اُس نے پہلے سمجھا کہ بچّے کو اُس کے ماں باپ نے پڑھایا ہے مگر جب اُس نے اُس کی آنکھوں میں دیکھا تو اُن میں اتنا خلوص اور اتھاہ پیار تھا کہ وہ سمجھ گئی کہ اُس کا پیار اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ بچّے بھی اب شاید واقف ہو گئے تھے اُس محبت سے جو اُس کو مجھ سے تھی۔ اس نے اپنا تحفہ واپس لے لیا اور امجد کو چُوم چوم لیا اور رو دی اور چلی گئی۔ اُس کے بعد وہ ہمارے گھر نہ آئی۔

اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد تک وہ اسکول بھی نہ آئی۔ جب آئی تو مجھ سے ملنے سے گریز کرتی رہی لیکن ایک دن میں اسکول کی لائبریری سے نکلا تو اُس کو منتظر پایا۔ وہ مجھے اپنے کلب لے گئی۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد اس نے کہا:

'میں جانتی ہوں کہ میں نے تم سے اظہارِ محبّت کر کے زیادتی کی ہے۔ تمہاری بیوی بہت ہی حسین، بہت ہی باصلاحیت، بہت ہی باخلق اور بلند اخلاق انسان ہے۔ تمہارے بچّے بہت پیارے اور بہت ذہین ہیں۔ وہ محبّت کرنا جانتے ہیں۔ وہ شاید جانتے ہیں کہ میں تم سے محبّت کرتی ہوں۔ تمہاری بیوی تو یقیناً جانتی ہے۔ مگر اُس نے کبھی اس کی طرف اشارہ تک بھی نہیں کیا اور اُس کے طرزِ عمل میں اظہار پانے والے پیار میں ذرا بھر بھی کمی نہیں آئی۔ بڑجیس کس مٹی کی بنی ہے کہ اس میں حسد اور جلن ذرا بھر بھی نہیں۔ وہ مجھ سے پیار کرتی ہے اس طرح جس طرح میں تم سے کرتی ہوں مگر اُس میں کسی قسم کا تقاضا، لالچ، رشوت کا شائبہ تک نہیں۔ اُس میں اِس بات کا غرور اور اعتماد کا فخر بھی نہیں کہ وہ تم سے محبّت کرتی ہے اور

اس کو تمہاری محبت پر پورا پورا اعتماد ہے۔ اُس کے عمل میں للکار بھی نہیں جس کو میں اپنی بیٹی سمجھوں۔ جس سے وہ محبت کرتی ہے تو بس کرتی ہے اور کسی شے کا جذبے کا تقاضا نہیں کرتی۔ وہ دیتی اور دیتی ہی چلی جاتی ہے اور کبھی نہیں سوچتی کہ وہ غریب ہو جائے گی اور ایسا وقت آ سکتا ہے کہ اس کے پاس دینے کو کچھ نہ رہے۔

کبھی کبھی میرے دل میں اُسی کی ہیبت چھا جاتی ہے اور میں رات بھر جاگتی رہتی ہوں۔ اُس کی محبت ان لمحوں میں بھی میرا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ اُس کی محبت عظیم ہے۔ وہ عظیم ہے۔ میری محبت جس پر میں ناز کرتی ہوں، اُس کی محبت کے رُو برُو بہت ہی چھوٹی ہے، اگرچہ حسین ہے۔

میں کبھی بھی برجیس کی رقیب بننا پسند نہیں کروں گی اگرچہ وہ مجھے اپنا رقیب نہیں سمجھتی اور مجھ سے بیک وقت بہن، ماں اور چاہنے والے کی طرح پیار کرتی ہے اور اُس کے پیار نے میرے گرداگرد ایک ہالہ بُن دیا ہے جو بیک وقت میرا قلعہ بھی ہے اور قید خانہ بھی۔ میں اپنے خدا کی شکر گذار ہوں کہ اس نے ایسی عورت کو پیدا کیا اور اُس سے مجھے روشناس کرایا اور اُس کی محبت سے مجھے سرفراز کرایا۔ اُس کی محبت کے لئے میں ممنون محسوس کرنا چاہتی ہوں مگر کبھی محسوس نہیں کر پائی۔ مجھے ہمیشہ لگا ہے کہ یہ اُس کی محبت کی توہین ہو گی اور میں اُس کی محبت کی توہین کے تصور ہی سے لرز اُٹھتی ہوں۔ کبھی کبھی مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں انسانوں کے درمیان رہتے ہوئے اِک مافوق الانسان سے آشنا ہو گئی ہوں، جو فوق الانسان ہونے کے باوجود نٹشے کے فوق البشر سے بہت ہی، بلکہ یکسر مختلف ہے۔ اُس کے قرب سے ہیبت تو جاگتی ہے مگر اُس میں محبت اس طرح رچی بسی ہے کہ اس سے خوف نہیں احترام کے جذبات دل و جان میں بیدار ہوتے ہیں، اُس کے لئے اور خود اپنے لئے۔ یہ میرے لئے بہت اجنبی جذبہ ہے اِس کا ذکر دُنیا کے اد

ہیں مَیں نے کہیں نہیں دیکھا۔ مجھے کبھی کبھی اپنے جذبات کی حقیقت پر شک ہونے لگتا ہے، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ مَیں کوشش کر کے اِس پر شک کرتی ہوں اور کبھی کامیاب نہیں ہو پاتی۔ اس کو حقیقت ماننا ہی پڑتا ہے۔ یہ اتنی بدیہی ہے کہ انحراف اور شک ممکن ہی نہیں۔

میں اپنی محبّت سے دستبردار ہونے کے لئے بالکل تیار نہیں ہوں۔ میں چاہوں گی کہ تم مجھ سے اُس وقت تک اِسی طرح ملتے رہو جب تک برجیس تمہیں اس سے منع نہ کر دے۔ مَیں یہ جانتی ہوں اور شاید تم بھی جانتے ہو کہ وہ ایسا کبھی نہیں کرے گی۔ وہ محبّت کی عظمت کو جانتی ہے، تسلیم کرتی ہے، اس پر ایمان رکھتی ہے۔ اس لئے شاید یہ بہتر ہو گا کہ تم سے کہوں کہ اُس وقت تک اِسی طرح ملتے رہو جب تک تم اس ملنے سے کسی طرح کا بوجھ اپنے ذہن، دل اور تخیّل پر محسوس نہ کرو یا تمہاری ہمّت جواب دے جائے۔

'برجیس ہی کی محبّت کو ہضم کرنا بڑا جو کھم سمجھا کرتا تھا اور اب تمہاری محبّت کو بھی ہضم کرنے لگ گیا ہوں۔ کتنا پیٹو ہوں۔ برجیس کی عظمت کا مَیں قائل تھا ہی۔ اب تمہاری عظمت کا بھی قائل ہونا پڑے گا۔ مَیں اپنے رب کی اس قدر عنایات سے خوف کھانے لگا ہوں کہ آیا مَیں اِن عنایات کا ذرا بھر بھی شکر ادا کر سکوں گا کہ نہیں۔ اللہ کی دی ہوئی صلاحیتوں کو اُس کے قوانین کے مطابق کارفرما کر سکوں گا کہ نہیں۔

'برجیس سے ملاقات سے پہلے شاید، بلکہ یقیناً، تم ایسے نہ تھے۔ اُس نے تم سے نکاح کیوں کیا یہ مَیں نہیں جانتی مگر نکاح کے بعد تم وہ نہیں رہے جو تم نکاح سے پہلے تھے۔ اب تم اُس کے زوج ہو۔ تم محبّت بے تقاضہ کرنے کے اہل ہو اگرچہ اتنے نہیں جتنی برجیس ہے۔ مَیں اُس سے محبّت کرتی ہوں اور اُس کی پرستش بھی اگرچہ اس کو خدا نہیں جانتی، خدا کا مظہر بھی نہیں۔ وہ خدا کا استعارہ اور خدا نما ضرور ہے۔

اُس کا خدا کیسا ہے یہ میں نے جاننے کی کوشش نہیں کی اور اب یہ جاننا ممکن نہیں
کیونکہ مجھے اُس کے رُو برو اور اس کے بچوں کے رُو برو جانے کی تاب نہیں۔ وہ
اتنی محبّت سے پیش آتے ہیں کہ میں کبھی بھی اپنے آپ کو اس کا حقدار نہیں سمجھ سکی۔
حق سے زیادہ ملے تو اس کو تحفہ سمجھیں، خیرات سمجھوں یا صرف محبّت، یہ میں فیصلہ
نہیں کر پائی۔

تمہارے رُو برو آتے ہوئے مجھے شرمساری نہیں ہوتی، حجاب نہیں آتا، لاج نہیں آتی
کیونکہ میں اپنے آپ کو تمہاری محبّت کی حق دار سمجھتی ہوں۔

ہم دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ رات کا کھانا کھایا اور بعد میں ایک دوسرے
کو الوداع کہی۔ اس کے بعد تقریباً ہر روز ہماری ملاقات اسکول کے کتب خانے
میں ہوتی۔ ہم وہاں بیٹھ کر گھنٹوں پڑھتے۔ کبھی وہ مجھ کو اور کبھی میں اُس کو گھر کی
نکڑ تک چھوڑنے چلے جاتے۔ کبھی کبھار برجیس کے ساتھ میرا وقت گذر نا کم ہو جاتا۔
برجیس کبھی اس کا خیال نہ کرتی۔

پٹیشیا میں کئی رؤسا کے لڑکوں نے دلچسپی کا اظہار کیا۔ وہ اُن سے اچھی طرح
ملتی مگر کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ وہ اس سے اظہارِ محبّت کرے یا نکاح کا پیام دے۔

ایک دن تعطیل تھی۔ میں گھر پر تھا، ارادہ تھا کہ سارا دن گھر پر ہی رہیں گے اور رات
کو اوپیرا دیکھنے چلیں گے۔ ملازم مارکوئیس مُور لینڈ اور لارڈ چلٹن ہیم کے تعارفی
کارڈ لے کر آئی۔ دونوں انگلستان کے معاشرے اور اُس کی سیاسی زندگی کے بہت
اہم رُکن تھے۔ میں ان سے ملا۔ انہوں نے آغاز میں انگریزوں کے معمول کے مطابق
اِدھر اُدھر کی، موسم کی، سیاست کی، بات کی، میرے علم اور زبان دانی کی تعریف کی۔
آخر تان پٹیشیا پر ٹوٹی۔

Petitia کے خاندان کا انگلستان کے رؤسا میں بلند مقام ہے۔ اُس کے

خاندان کا تعلق انگلستان کے قدیم رؤسا کے خاندانوں سے بہت تہہ در تہہ ہے۔ شاہی خاندان سے بھی اُس کا رشتہ بہت قریبی ہے۔

'میں جانتا ہوں جب اس سے میری دوستی نئی نئی تھی تو یہ باتیں لوگوں نے اہتمام سے میرے کانوں میں ڈالیں تھیں۔ اپنے ملک میں میری حیثیت اُس سے کسی طرح کم نہیں ہے'۔

'یہ درست ہو سکتا ہے۔ اِس سے ہمیں کچھ غرض نہیں۔ ہم یہ ضرور جانتے ہیں کہ آپ کی بیگم ہندوستان کے ایک قدیم رئیس خاندان سے ہے اور برٹش سرکار نے اُس خاندان کے افراد کو بہت عزت اور بہت اعزازوں سے نوازا ہے۔ وہ خود بھی بہت نجیب اور نبیل خاتون ہیں۔ Petitia اُن کے بلند اخلاق، میلانِ طبع اور اُن کی محبت کیشی کا اکثر ذکر کرتی رہتی ہے۔ وہ آپ کے بچّوں کی ذہانت، اعلیٰ تربیت اور نفیس طبیعت کی بہت مدّاح ہے۔ وہ آپ کے خاندان کے ہر فرد سے بہت محبت کرتی ہے اتنی کہ اُسے اپنے مستقبل کا بھی خیال نہیں۔ آپ لوگ اس سے اس قدر پیار و محبت کرتے ہیں کہ وہ ایک غیر ارضی فضا میں ہر دم سانس لیتی ہے۔ اگرچہ وہ اپنے معاشرتی فرائض کبھی نہیں بھولتی اور پوری باریک بینی سے اُن کو سر انجام دیتی ہے مگر اُس کے گرد اگرد اِک ایسا ملکوتی ہالہ رہتا ہے کہ کوئی نوجوان اُس میں ایسی دلچسپی نہیں لیتا یا لینے کا تصور نہیں کر سکتا کہ وہ اُس کو نکاح تجویز کرے۔ کوئی انگریز رئیس مرد اپنی بیوی کو چبوترے پر بٹھا کر اُس کی پرستش کی سوچ بھی نہیں سکتا اور Petitia کا سارا طرزِ عمل پکارتا ہے کہ مجھے مقامِ بلند پر بٹھاؤ اور پُوجو۔ یہ طرزِ عمل ہر قابلِ قبول مرد کی تذلیل کرتا ہے۔ نوجوان اُسی کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں اور اُس کے ملکوتی ہالے سے مرعوب ہو کر دُور چلے جاتے ہیں۔ یہ صورتِ حال اُس کے خاندان کے لئے بہت ہی تشویش ناک ہے۔ جب تک آپ انگلستان میں

ہیں، اُس سے ملتے رہتے ہیں اور اُس سے محبّت کرتے رہتے ہیں، اِس صورتِ حالات میں کوئی تبدیلی نہیں آسکتی۔ وہ آپ سے شادی بھی نہیں کرنا چاہتی کہ وہ آپ کی بیگم کی سوکن بننے کا تصوّر کرنا بھی جُرم اور اخلاق سے گری ہوئی بات سمجھتی ہے۔ آپ کی بیگم اس کو اس قدر محبوب، اتنی محترم اور مکرم ہیں کہ اُن کی ہمسری کو وہ تکبّر گردانتی ہے۔ ایسی صورت میں اس کا کنوارہ رہنا لازم نظر آتا ہے۔ یہ ظلم ہو گا۔'

'اِس سلسلے میں مَیں کیا کرسکتا ہوں؟'

'آپ اس کی زندگی سے نکل جائیں۔ اُس سے بہت دُور ہو جائیں۔ اِس سے اُس کو صدمہ ہو گا اور دھچکا لگے گا تو ضرور مگر وہ اُس سطح پر ضرور آجائے گی جہاں ارضی مَرد اُس کو محبّت کا سزاوار ضرور سمجھیں گے۔ کیا آپ واپس اپنے دیس نہیں جاسکتے؟'

'بعض حالات ایسے ہیں کہ ہمارا واپس چلا جانا ممکن نہیں ہے۔ آپ کو یہ کیسے یقین ہے کہ وہ ہمارے چلے جانے کے بعد المیہ ڈرامے کی ایسی ہیروئن نہیں بن جائے گی جس کا المیہ دیکھنے والوں پر ہیبت طاری کر دے!'

'تو آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اِس صورتِ حال کا کوئی حل نہیں؟'

'نہیں۔ مَیں یہ نہیں کہتا۔ مَیں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہماری امکانی دُوری اِس معاملے کا حل نہیں ہے۔ اِس سے پیٹیشیا ایک عام عورت نہیں بن جائے گی۔ آپ کو یہ تسلیم کرنا ہو گا کہ پیٹیشیا ایک عام عورت نہیں ہے۔ اُس کی صلاحیتیں بہت اعلیٰ ہیں: اُس کا ذہن سوچنا جانتا ہے۔ اُس کے ذہن کی مار بہت دُور تک جاتی ہے، اُس کی طبیعت میں وسعت ہے اور گہرائی؛ اُس کے مزاج میں نفاست ہی نہیں حُسن بھی ہے؛ اشیا ہیں، اعمال ہیں، حُسن دیکھنے اور اُن کو پرکھنے کی نگاہ اُس کے فطری ذوق کی گہری لگن اور حاجت کی نشان دہی کرتی ہے، اور سب سے بالا یہ کہ اُس کے خُدا نے اُس کو کافی سوچ بچار اور بہت دلار اور پیار سے بنایا ہے۔ وہ اِک زیبس

عورت کی سطح پر جی نہیں سکتی۔ صرف وہی شخص اس کا شوہر ہونے کا اہل ہے جو اُس کے پائے اور روحانی مرتبے کا ہو۔ ایسے مرد اور عورتیں آپ کے معاشرے میں بہت نادر ہیں۔ اگرچہ اِک زمانے میں اتنے نادر نہیں تھے۔ شاید یوروپ میں اُس کے مرتبے کا کوئی مرد ہو۔ آپ اس کو یوروپ کے سفر پر لے جائیں۔ امریکہ بھی لے جائیں۔ شاید کوئی ہو وہاں جو اس کا ہمسر ہو'

You idealize her too much وہ عورت ہے۔ اور انگریز معاشرے کی صدیوں کی تہذیب اور تربیت نے اُس کو خلق کیا ہے۔ لہٰذا وہ انگریز عورت ہے اور اُس کو اپنا انگریز مقدر قبول کرنا ہوگا۔

'She is no mere English woman. She is a muse — She is a goddess. A god you must find for her. Or a human like unto the gods'

نادر علی خاں! ایسی باتیں نہ کریں۔ یہ صرف شاعروں کو زیب دیتی ہیں۔ ہم عملی آدمی ہیں اور عمل کی دُنیا میں رہتے ہیں اور ہمیں اس دُنیا کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے زندگی گذارنا ہے۔ آسمانِ بلند سے نیچے اُتر آئیں، ارض پر خداؤں کی باتیں، خداؤں کے لئے چھوڑ دیں'

'میرا خیال ہے میری بیگم اس معاملے میں آپ کی مدد کر سکے گی۔ میں اُس سے بات کروں گا۔ لیکن ایک بات میں پورے ہوش و حواس اور وثوق سے کہہ سکتا ہوں، کیوں میں ایک زمیندار خانوادے سے ہوں، مَیں نے زمین سے اُگنے والی اشیاء اور زمین پر رہنے والے جانداروں اور انسانوں کو بہت قریب سے دیکھا ہے، انگریز قوم کے افراد کو میں نے اپنے ملک میں بہت قریب، دوستی کی سطح پر، دیکھا ہے، اور ان کی عورتوں سے بھی میرے مراسم دوستانہ رہے ہیں۔

وہ بات یہ ہے کہ آپ Pentita کو عام انسانی سطح پر چلنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ یہ ظلم ہوگا۔ وہ اِک چلتی پھرتی لاش بن جائے گی اور ہر دم آپ کو ملزم ٹھہراتی محسوس ہوگی۔ اگر وہ کسی طرح اس پر راضی ہو بھی جائے تو اُس کے شوہر کو ایسے سے دوچار ہونا پڑے گا۔

آپ پر لازم ہے کہ اس کے لئے ایسا انسان ڈھونڈیں جو اُس کے احترام اور اکرام کا مستحق اور حقدار ہو، جو اس کی صلاحیتوں کو پہچان سکے، اُن کی قدر کر سکے، اُن کو قبول کر سکے، اُن کے لئے عمل پیرائی کے میدان فراہم کر سکے اور اس کے عوض کسی قسم کا تقاضہ نہ کرے۔ اس لئے یہ قطعی ضروری ہے کہ آپ اُس کو اُن تہذیبوں میں رہنے کا موقع فراہم کریں جہاں کے مرد اُس سے معاشری سطح پر نہیں اِنسانی سطح پر آشنا ہو سکیں اور وہ کسی مناسب انسان کو اپنے لئے منتخب کر سکے۔

"ہمارا خیال ہے آپ کی دونوں تجاویز مناسب ہیں۔ اپنی بیگم سے ہمارا پیشگی شکریہ پہنچادیں ہم ممنون ہوں گے اگر وہ Pentita کے والدین، لارڈ بورن متھ اور لیڈی بورن متھ کی ہفتے عشرے تک مہمان رہیں۔ آپ کا وہاں نہ ہونا منزل کی طرف گامزن ہو جانے کے لئے مناسب ہوگا۔ آپ اس بات کا بُرا نہ مانیں۔ آپ مارکوئیس مولینڈ کے یہاں اثناء عرصہ مہمان رہیں۔ اِن کی علم دوستی محض معاشرتی زینت نہیں ہے اور اِن کا کتب خانہ بہت اچھے ذوق کا ثبوت مہیا کرتا ہے اور اِنہوں نے مشرق میں بھی کئی سال سفر کیا ہے اور وہاں کے نوادرات اُن کی جاگیر کی زینت ہیں۔ آپ وہاں قطعاً بور نہیں ہوں گے۔ وہاں آپ کو مصروف رکھنے کے لئے بہت کچھ ہے۔ یہ خاموش رہنا بھی خوب جانتے ہیں۔ اُمید ہے کہ آپ ہماری دونوں تجویزیں قبول کریں گے۔ چند دن بعد ہم آپ سے

رابطہ قائم کریں گے۔ اب اجازت دیجئے۔ آپ نے ہمیں نااُمید نہیں کیا۔ اِس کے لئے ہم آپ کے ممنون ہیں"۔

میں نے برجیس کو اس گفتگو سے آگاہ کیا تو وہ مسکرائی اور بولی:۔

"تم نے وعدہ کر لیا تو اب نبھانا ہی ہوگا۔ میں کوشش کروں گی کہ آپ کو مایوس نہ کروں۔ میں پیٹیشیا کے معاملے میں بہت کٹھن مراحل سے گذر چکی ہوں۔ یہ مرحلہ تو اُس کے مقابلے میں بہت ہی آسان ہے۔ شاید تمہارے لئے مارکوئیس کی مہمانی صبر آزما نہ ہو"۔

جب برجیس لارڈ بورن متھ کے یہاں گئی تو اُس نے بتایا کہ اُس نے طے کر لیا ہے کہ ہم پیرس منتقل ہو جائیں، وہاں ہمیں لارڈ بورن متھ نے اپنا مکان رہائش کے لئے پیش کیا ہے مگر وہ اپنے لئے گھر کرائے پر لے کر رہے گی، لارڈ بورن متھ نے اُس کو چند اعلیٰ خاندانوں کے لئے تعارفی خط اور تحائف دیئے تھے اور اُن کو خطوط بھی لکھ دیئے تھے، ہمارا وہاں قیام دوستوں کے درمیان ہوگا؛ جونہی ہم پیرس منتقل ہو جاتے ہیں تو لارڈ بورن متھ، لیڈی بورن متھ اور پیٹیشیا یوروپ کے طویل سفر پر روانہ ہو جائیں گے اور اختتام پر ہمیں ملنے ضرور آئیں گے۔

۲

"ہم پیرس منتقل ہو گئے۔ برجیس نے طب میں اپنی علمی اور مشقی صلاحیت بڑھانے کے لئے ڈاکٹریٹ کی اور بعد ازاں عورتوں کے امراض میں اختصاصی صلاحیت حاصل کرنے کے لئے فرانس کے طبیبوں کی مرکزی انجمن کے زیر اہتمام چلنے والے ادارے کی فیلوشپ حاصل کرنے کے لئے داخلہ لے لیا۔

فیلوشپ کی تیاری کے دوران دوسرا رمضان آگیا۔ پندرہ رمضان کی تیاری میں تمام ملازم مصروف تھے۔ برجیس، بچے اور میں ڈرائنگ روم سے متعلقہ کمرے میں تلاوت میں مصروف تھے کہ بیرونی دروازے کی گھنٹی بجی۔ تھوڑی دیر بعد ہماری فرانسیسی ملازمہ ایک تعارفی کارڈ لے کر آگئی۔ میں اُس وقت تک مقررہ حصۂ قرآن کی تلاوت ختم کر چکا تھا اور برجیس تلاوت مکمل کرنے والی تھی، کہ ہر روز یہی ہوتا تھا کہ ہم آگے پیچھے تلاوت ختم کرتے تھے۔ لارڈ بورن تھے، لیڈی بورن تھیں اور پٹیشیا آئے تھے۔

میں مہمانوں کو لینے دروازے تک گیا اور ان کو خوش آمدید کہا۔ اس پر وہ حیران ہوئے۔ میں نے ان کو بتایا کہ میرے مُلک میں بزرگوں کو اِسی طرح گھر کے دروازے پر خوش آمدید کہا جاتا ہے۔ اُن کو لے کر ڈرائنگ روم آیا تو برجیس فارغ ہو کر مہمانوں کی منتظر تھی مگر بچے ابھی تک میرے کمرے میں تلاوت میں مصروف تھے۔

پٹیشیا نے بیٹھتے ہی پوچھ لیا:۔

' معلوم ہوتا ہے کہ آپ دونوں اہم اور گہری گفتگو میں دل وجان سے مصروف تھے۔ ہم نے آپ کی مجلس کو برہم کر دیا۔ اِس کے لئے معذرت ہی کی جاسکتی ہے، تلافی تو شاید ممکن نہ ہو۔'

' تمہارا اندازہ ایک طرح سے درست قرار دیا جاسکتا ہے۔ ہم دونوں قرآنِ حکیم کی تلاوت کر رہے تھے۔'

' اُو! میرے خدایا! یہ رمضان کا مہینہ ہے۔ مجھے بالکل دھیان نہیں رہا۔ ہم کئی سالوں سے سفرِ یورپ پر ہیں، شمالی افریقہ نہیں گئے، اس لئے ذہن سے یہ بات اُتر گئی۔'

'رمضان کے دوران دوستوں سے یا اجنبیوں سے ملنے کی ممانعت نہیں ہے۔ صرف ضبطِ نفس کا مطالبہ ہے۔ کھانے پینے کی ممانعت اِسی کا حصّہ ہے غیر مسلم دوستوں کی مہمانداری کی ممانعت بھی نہیں ہے۔

"بچے کہاں ہیں؟"

'ساتھ والے کمرے ہیں۔ وہ جونہی تلاوتِ قرآن ختم کر لیتے ہیں حاضر ہو جائیں گے۔'

'مجھے کبھی اندازہ نہیں ہوا کہ آپ لوگ اتنے التزاماً مذہبی ہیں۔'

اہم مغربی زبانوں کی اصطلاح میں قطعی مذہبی نہیں ہیں۔

اِسی لئے مجھے گمان بھی نہیں ہونے دیا کہ آپ کی زندگی میں مذہب کو اتنا عمل دخل ہے،

'قرآن کائنات اور حیات کے متعلق فلسفہ اور لائحہ عمل پیش کرتا ہے' جو کائنات کے حقائق اور زندگی کے مسائل کو مربوط دیکھتا ہے اور دونوں کے سوالوں کے تشفی بخش جواب اور حل پیش کرتا ہے' جو علم و عقل اور حکمت کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں۔ اِس لئے اس کا نام قرآن میں مذہب نہیں' دین ہے' جو راہ' قانون' آئین' غلبہ' اقتدار' اختیار' حکومت' مملکت کے مفاہیم پر محیط ہے۔ اِس دین کو قبول کرنے سے انسان میں ربط و ضبط تو آتا ہے مگر کشاد کی راہوں سے تمام رکاوٹیں نظری اور نفسیاتی طور پر دُور ہو جاتی ہیں اور اُن کا عملاً دُور کرنا زندگی کا وظیفہ بن جاتا ہے۔ اس ضبط کے قواعد کی نوعیت اُسی طرح کی ہے جیسی کہ زبان کے لئے گرامر کی' فن کے لئے اُس کے قواعد کی۔ جن کے بغیر تخلیق ممکن نہیں ہو سکتی جب ہم زندگی اور فن اور سائنس کے کسی شعبے میں پابندیوں کو قبول کرتے ہیں تو اُس سے تخلیق اور کشف کی بے شمار راہیں کُھل جاتی ہیں۔ اِن پابندیوں کا مقصد ہی یہ ہے کہ انسان کے اندر وسعتیں پیدا ہوں

ان قواعد اور پابندیوں اور دین کے قوانین اور پابندیوں میں اک بڑا فرق ہے کہ دین کو اُس کے خالق نے وضع کیا، جو کائنات، ارض اور انسان کا خالق ہے اور اپنی مخلوق کے امکانات اور اُن کی حدود کو بہت ہی اچھّی طرح جانتا ہے کہ اُس نے ہی یہ حدود اور امکانات کے پیمانے اور قوانین مقرر کیے، مگر زبان، ادب، شعر اور فنون اور سائنس کے قواعد اور قوانین خود انسان نے وضع کیے لہٰذا اُن میں حک و اضافے، ترامیم اور تشکیلِ نو کی ضرورت ناگزیر ہے۔ مگر اللہ کے قوانین ابدی ہیں اور جہاں اُس نے ان قوانین کے اطلاقی قواعد خود نہیں وضع کر کے دیئے اُن کو خود انسان اِن قوانین کی روشنی میں، اُن سے ہم آہنگ ہوتے ہوئے ان کے مطابق وضع کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔

'آپ لوگوں کا خدا مذہبی لوگوں کے خدا سے یقیناً مختلف ہے'۔

'مختلف ہی نہیں یکسر مختلف ہے۔ اُس کے ہونے کا تصوّر دل و ذہن اور تخیّل میں تحیّر کو جگاتا ہے، اُس کی عظمت اور سطوت اک ہیبت پیدا کرتی ہے، جو تقاضہ کرتی ہے کہ پناہ ڈھونڈو اور علم و عقل اور وجدان کہتا ہے کہ یہ صرف اللہ کے یہاں مل سکتی ہے کہ وہی اِس کائنات، اِس ارض، اِس حیات اور اِس انسان کا خالق اور مالک ہے اور اپنی مخلوق کو ابتدا سے انتہا تک لے جاتا ہے؛ اور ہر منزل پر اُس کے لئے بلا مُزد رزق مہیّا کرتا ہے۔ اللہ کا اقتدار محض طاقت کے بل بُوتے پر مسلّط نہیں ہے بلکہ حکمت اور قانون کے مطابق قائم اور جاری و ساری ہے۔ ہر شے اس قانون کی طوعاً اطاعت کرتی ہے اور کرہاً'

'تم واقعی قرآن ہی کی تلاوت کر رہے تھے۔ تم میں تم سے بہت بڑی طاقت اس لمحے کلام کر رہی تھی...... میرے لئے تمہاری شخصیت کا ایک نیا اور انوکھا پہلو آج اس لمحے منکشف ہوا، جو مجھے واقعی دہلاتا ہے اور اک عظیم حُسن کا احساس

دلاتا ہے . . . . جیسے چاند کے بغیر تاروں بھری رات کے دوران میں مجھے کسی پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا کر دیا گیا ہو اور چاروں طرف دُور دُور تک کوئی انسانی آبادی نہ ہو۔ مَیں یوں کائنات کی سطوت کے رُو برُو بالکل تنہا ہوں۔ میں اپنے آپ میں اپنے اندر، محسوس کر رہی ہوں اِک ضرورت اور حاجت پناہ تلاش کرنے کی . . . . . کون ہو گا جو مجھے پناہ دے گا!'

'وہی جو پناہ دے سکتا ہے، ہر ایک کو پناہ دیتا ہے، جو اس کی پناہ کا متلاشی ہو۔

'تم پر میرے رشتہ داروں کا الزام صحیح ہے کہ تم مجھے ایسی فضا میں لے جاتے ہو جہاں عام انسان سانس بھی نہیں لے سکتا، دَم نہیں مار سکتا، جہاں انسان انسانیت سے ماوراء ہو جاتا ہے، فوق الانسان بن جاتا ہے، جو عام انسان کو اپنے آپ سے دُور بھگاتا ہے۔'

یہ درست ہے کہ یہ فضا عام انسانوں کے لئے اجنبی ہے اور تحیّر کو جنم دیتی ہے، پناہ ڈھونڈنے کا تقاضہ کرتی ہے مگر جو پناہ دینے والے کی پناہ میں آجاتے ہیں وہ دوسرے انسانوں کو پناہ دینے کے اہل ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے یہ فرض اور طلب بن جاتی ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کی پرورش اور زکا، تربیت اور تہذیب اور ارتقا کا بندوبست کریں جو اِن کی حاجت محسوس کریں۔ مگر بیشتر انسان اُس عقل اور علم پر مطمئن ہوتے ہیں جو اُن کو ملا ہوتا ہے اور اِن میں زیادتی کی خواہش اور آرزو نہیں کرتے۔ وہ صرف دولت اور مرتبے اور اقتدار کی آرزو کرتے ہیں اور اِن کے لئے اُن کی ہوس کی کوئی انتہا نہیں ہوتی اور اسی کوشش میں وہ موت کے لمحے تک کوشاں رہتے ہیں یا اس کے خواب دیکھا کرتے ہیں، اس کی خاطر اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دینے پر کمر بستہ رہتے ہیں۔

جو شخص عقل اور علم میں زائد کی، اضافے کی آرزو کرتا ہے وہ خود نگر، خودگر اور انسان دوست ہوتا ہے۔ اُن کے دوست، ان کے اقربا اُن سے ہر دم سیراب اور فیض یاب ہوتے رہتے ہیں۔ وہ انسانوں کی، اپنے معاشرے کی تشکیلِ نو کے لئے کوشاں رہتے ہیں، اوروں کو اس کام میں شرکت کے لئے اُبھارتے رہتے ہیں اور اپنی معیت اور تعاون کا یقین دلاتے رہتے ہیں۔'

'پچھلے چند سالوں سے ہم سفر میں ہیں اور پیٹیشیا سے ہمیں پہلے کبھی اتنا قرب نہیں رہا۔ ہم نے محسوس کیا ہے کہ وہ ہمارے لئے اِک نعمت ہے فضل ہے اور ہمیں اکثر اس پر حیرت ہوئی ہے کہ ہم نے اُس کو جنم دیا ہے اور اُسی ماحول نے اُس کی پرورش کی ہے جو کم و بیش ہمارا تھا۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ ہمارا دل تشکر کے جذبے سے بھرپور ہوا مگر اُس کا اظہار کرنے کے لئے ہمیں الفاظ نہ ملے کہ بیٹی کا وجود ہمارے معاشرے میں ایسے جذبات کو جنم نہیں دیتا۔ لہٰذا اِس کے لئے الفاظ وضع ہی نہیں ہوئے۔

'ہماری بیٹی جو کچھ بھی ہے وہ تمہاری دوستی کے سبب ہے۔ تم نے اُس کی تربیت اور تہذیب کی ہے، مگر اس کا پھل ہم کھا رہے ہیں اگرچہ حق تمہارا تھا۔ اِس خیال سے ہم کئی بار اپنے دل میں نادم ہوئے اور سوچا کہ خط میں تم سے اِس کا اظہار کریں۔ ایک آدھ مسودہ خط کا تیار بھی کیا مگر وہ اِس قدر پھسپھسا اور بے رس لگا کہ اپنے جذبے کی توہین محسوس ہوا۔ لہٰذا پھاڑ دیا۔

آج ہم جب آئے تھے تو ارادہ کر کے آئے تھے کہ اپنی ندامت اور راحت دونوں کا اظہار تم سے کریں گے مگر نہ جانتے تھے کہ اِس کا اظہار کیونکر ہو سکے گا۔ خیال تھا کہ جب پیٹیشیا بچوں میں مصروف ہو جائے گی تو اُس لمحے اِس کا اظہار کر دیں گے۔ لیکن آپ کی پیٹیشیا سے گفتگو نے موقع فراہم کر دیا ہے۔ ہم دونوں

میاں بیوی ممنون ہیں اور بیگم نادر علی آپ کے بھی کہ آپ کی خاموشی نے اس فضا کو تیار کرنے کے لئے وہ لوازمات مہیا کئے جن کے پیشگی وجود کے بغیر اس فضا کا جنم لینا محال تھا۔ وہ دس دن جو آپ نے اور آپ کے بچوں نے ہمارے یہاں گذارے وہ ہم دونوں کے لئے اِک ختم نہ ہونے والا خزانہ ہے، جس کی قدر و قیمت زندگی کا ہر لمحہ ہم پر مختلف پہلوؤں سے سجھاتا رہتا ہے اور ہم اپنی خوش بختی پر حیران ہوتے رہتے ہیں اور اس بات پر نادم ہوتے رہتے ہیں کہ ہم نے اور ہمارے رشتہ داروں نے نادر علی خاں کی قدر نہ پہچانی اور ان کو پٹیشیا کے طرزِ عمل کے لئے گنہگار تصوّر کیا اور آپ کو انگلستان سے فرانس منتقل ہونے پر راضی کیا۔ یہ گناہ ہے جس کی تلافی ممکن نظر نہیں آتی اور اس کے لئے معافی مانگنے کی بھی جرأت نہیں ہوتی اگر آپ پٹیشیا کے برجیس اور میرے ساتھ تعلقات کی نوعیت کو سمجھ نہیں سکے تو اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں ہے کیونکہ ان کی نوعیت بہت انوکھی اور انہونی تھی۔ ہم دونوں میاں بیوی ایک نوجوان لڑکی سے بہت گہری اُلفت کے رشتے میں بندھ گئے تھے اور اس بندھن پر مطمئن تھے، راضی تھے، خوش تھے اور وہ نوجوان لڑکی نہ صرف اس اُلفت کے رشتے پر نادم نہ تھی، بلکہ خوش تھی اور فخر محسوس کرتی تھی کہ اس کی حقدار تھی۔ لیکن چونکہ یہ رشتہ اس معاشرے اور ماحول کے لئے اچھوتا بندھن تھا، جو بندھن سے زیادہ اِک ایسا قرب تھا جو جسمانی قرب کا تقاضہ نہ کرتا تھا، اگرچہ اس معاشرے کے متفقہ نقطۂ نظر کے مطابق اس رشتے پر جسمانی قرب کا تقاضا کرنا لازم آتا تھا۔

برجیس نے مجھے بتایا ہے کہ آپ کی جاگیر پر بہت ہی وسیع و عریض باغات ہیں۔ اس لئے یقیناً آپ جانتے ہوں گے کہ بعض درخت ساتھ ساتھ بوئے جائیں تو وہ ایک دوسرے کی پرورش میں بہت مفید ہوتے ہیں اور ایک دوسرے

میں ایسا رنگ و روغن اُبھارتے ہیں جو اُس حالت میں اُن میں نہیں اُبھرتا جب وہ الگ الگ جگہ بوئے جائیں۔ لیکن اِس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اُن کو پیوند کر دیا جائے۔ اگر اُن کو پیوند کر دیا جائے تو وہ دونوں پروان نہیں چڑھتے، کبھی پھل نہیں دیتے۔ میرا اور پیٹیشیا کا رشتہ اِسی نوعیت کا ہے۔ اِس رشتے کے اثمار کا رس بہت لذیذ ہے اور یہ لذت انوکھی۔ ہم دونوں ہی کے لئے نہیں بلکہ ہر اُس شخص کے لئے بھی جو پیٹیشیا کے قریب ہوگا، آئے گا۔

اِس رشتے سے جو غلط فہمیاں پیدا ہوئیں تو اِس کی وجہ یہ ہے کہ اکثر لوگ اِنسان کی صلاحیتوں اور اُس کی وسعتوں، گہرائیوں اور بلندیوں، کا بہت ہی محدود اندازہ لگاتے ہیں۔ انسان کے امکان لامحدود ہیں اگرچہ اپنے خدا کے مقابلے میں یہ امکانات یقیناً محدود بلکہ بہت ہی محدود ہیں مگر دوسری مخلوق کے مقابلے میں یہ لامحدود ہی قرار پائیں گے۔ آپ کے معاشرے میں لوگ اپنی تہذیب کی تاریخ کے حوالے سے ایسے لوگوں سے آشنا ہیں اور اُن کو نابغہ کہتے ہیں لیکن چونکہ اِن نابغہ کا اظہار اَدب اور فنون میں ہوا ہے نہ کہ اُن کی شخصیت میں اس لئے اُن کی شخصیت کی ناہمواریوں کو اُن کی بے قاعدگیاں کہہ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی ایسا ہوا ہے اور ہر تہذیب میں ایسا ہوا ہے کہ کوئی ایسا شخص پیدا ہوگیا جس کی نابغیت کا اظہار اُس کی شخصیت کے تار و پود میں ہوا۔ ایسا شخص اپنے اعمال میں خالق ہے اور اس کی تخلیقِ اعمال اس کا تقاضہ کرتی نظر آتی ہے، محسوس ہوتی ہے، کہ اپنے آپ کو بدلو کہ تم میں خود گری بطورِ امکان ودیعت کی گئی ہے۔ اِس تقاضے کی ماہیت کو لوگ سمجھ نہیں پاتے اور زِچ ہوجاتے ہیں اور خالق انسان کو مجرم گردانتے ہیں کہ وہ نہ صرف خود معاشرے کے مروجہ سانچوں میں نہ ڈھلا بلکہ دوسروں کو بھی للکارتا ہے کہ اپنی شخصیت

کے لئے نیا قالب تخلیق کریں۔

'آپ کا منظرِ حیات یقیناً اُس معاشرے اور اس تہذیب کی تخلیق نہیں جس پر میرے ملک اور مری تہذیب کی حکمرانی ہے۔ یہ منظرِ حیات کسی تہذیب کی تخلیق نظر نہیں آتا بلکہ خالق انسانوں، ارض اور کائنات سے ماوراء اُن کے خالق ہی کی تخلیق ہو سکتا ہے، جو انسانوں کی ہدایت کو فرض جانتا ہے اور اِس کا انتظام کرتا ہے،

'آپ کی فکر صحیح مقام پر پہنچ گئی ہے۔ مجھے اِس میں کسی قسم کی ترمیم یا اضافے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی،

'خالہ آداب اور آپ پر سلام۔ خالہ ابو آپ کو بھی آداب عرض ہے اور آپ پر بھی سلام ہو!

'امجد جمیل! تم اتنے بڑے ہو گئے، کہ اب تم کو چومتے ہوئے مجھے حیا آئے گی۔ اور، تم بتول! تم سے تو حسد کرنے کو جی چاہتا ہے کہ تم بہت خوبصورت نکل آئی ہو۔ اور ننھے میاں! تم تو شرجیل ہی ہو سکتے ہو۔ آؤ تمہیں چوم لوں۔ تم کو چومتے ہوئے حیا نہیں آئے گی،

'تم لوگوں کو ہمارے آنے کی اطلاع کس نے دی؟'

'آپ کی خوشبو نے! سب نے یک زبان ہو کر جواب دیا۔

'میں نے ایک عرصے سے خوشبو لگائی ہی نہیں،

'یہ خوشبو لگائی نہیں جاتی۔ یہ انسان کے اندر سے پھوٹتی ہے، امجد جمیل نے کہا۔

'بالکل، بتول اور شرجیل نے یک زبان ہو کر کہا۔

'ہمارے خاندان میں تمہاری ذاتی خوشبو کا بہت عرصے سے چرچا ہے۔ ہمارے

ہندوستانی اہلکار بھی اس سے آشنا ہیں اور اُن کے بچے بھی۔ ہمارے بچوں کا
یہ سب سے بڑا مخفی خزانہ ہے، برجبیں نے کہا۔

'اے شریر بچو ! اپنی خالہ کا راز افشا کرتے تمہیں حیا نہ آئی'
'یہ راز کبھی تھا ہی نہیں۔ خوشبو کبھی راز رہ ہی نہیں سکتی'، امجد نے کہا۔
'ناک نہ ہو تو شاید یہ راز رہ جائے۔ مگر میری تو ناک ہے'، بتول بولی۔
'اور میری بھی'، شرجیل پکارا۔
'بچو ! خالہ کو لاجواب تو نہ کرو'، برجبیں نے کہا۔
'ہماری خالہ ہے ہی لاجواب'، بتول نے اعتماد سے کہا۔
'اور ہم؟ پٹیشیا کے والدین نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
'آپ ٹھہرے خالہ کے ابّو اور امّی'، بتول چہکی۔
'بھئی! آپ لاجواب ہیں۔ آپ کے ابّو امّی بھی لاجواب ہیں'
'آپ سب مدحِ باہمی کی انجمن کے سرگرم رکن نظر آرہے ہیں'، پٹیشیا نے کہا
'سچ بولنا کب سے مداح کے زمرے میں داخل ہوا۔ امجد نے سوال کیا۔
'میرے فلسفی بھانجے! فرانسیسی تعلیم نے بہت پُر پُرزے لگا دیئے ہیں
تم میں'
'نہیں تو۔ یہ پُر پرزے آپ ہی نے لگائے تھے۔ اِتنی جلدی بھول گئیں، خالہ'
'بچو ! خالہ کو تیز طرار باتوں ہی سے ٹرخاؤ گے کہ کچھ کھلاؤ پلاؤ گے بھی'،
برجبیں نے کہا۔
'امّی، کھانے کے کمرے میں چچی نے برتن لگا دیئے ہیں اور کلارا ہم کو
بُلانے کے لئے چلی آرہی ہے'، بتول بولی۔
'آگئی ہے'، شرجیل نے گرہ لگائی۔

'آئیں۔ آپ کو بھوک اور پیاس کی حاجت تو ضرور محسوس ہو رہی ہوگی کہ بہت سفر کرایا آج نادر نے آپ کو'، بر جیس بولی۔

جب ہم سب کھانے کے کمرے میں داخل ہوئے تو کھانوں کی خوشبو نے اشتہا اور پیاس کو اور تیز کر دیا۔

'اتنا کچھ ہمارے لئے؟ افطار کا وقت تو ابھی ہوا نہیں'، پٹیشیا نے پکارا۔

'چچا نے یہ سب کچھ آپ کے لئے تیار کیا ہے کیونکہ ہمارے لئے وہ سادہ اور ہندوستانی غذا تیار کرتے ہیں'۔

'یہ آپ کے چچا میاں آپ کو سادہ غذا پر کیوں ٹرخا دیتے ہیں' پٹیشیا نے امجد کو چھیڑا۔

'ضبطِ نفس کے لئے سادہ غذا ہی مناسب ہے۔ آپ پر تو روزے فرض نہیں ہیں۔ ہم پر تو ہیں'۔

مہمان کو تو بہترین غذا پیش کی جانی چاہیئے۔ رمضان میں تو یہ اور بھی ضروری ہے تاکہ ہمیں معلوم ہو سکے کہ ہم اپنے نفس پر ضبط کے کس قدر اہل ہو چکے ہیں'۔ بتول نے گرہ لگائی۔

'آپ کے استاد بہت اچھے ہیں'، پٹیشیا نے دُلار سے کہا۔

'اور ہم بھی'، شرجیل فخر سے بولا۔

'یقیناً میرے بھانجے'۔

'شروع کریں نا۔ تکلف کو بھول جائیں۔ ہمیں راحت اور فرحت ہوگی۔ افطار میں اب زیادہ دیر نہیں۔ جہاں آپ نے ہمارا بہت سا انوکھا پن قبول کر لیا ہے اس محل کی اجنبیت کو بھی قبول کر لیں۔ ہمارے رو برو۔ آپ کا کھانا پینا ہمارے لئے امتحان بالکل نہیں ہے۔ ہمارے جسم و جاں اس ضبط کو قبول کرتے

ہیں۔ طعام کا مزا لے کر کھائیں۔ مہربانی ہو گی۔ برجیس نے کہا۔

"پٹیشیا نے کھانے کا آغاز کیا اور اس کے والدین نے اس کی پیروی کی۔ اُنہوں نے ایک ایک کھانے، گھر میں تیار کی ہوئی مٹھائیوں کو چٹخارے لے لے کر کھایا اور بہت داد دی پکانے والے کو۔ جب کافی کا دَور شروع ہوا تو افطار کا وقت ہو گیا اور ہم دوسرے کمرے میں منتقل ہو گئے، جہاں کھانا اور مشروبات فرش پر لگائے گئے تھے۔

پٹیشیا نے داخل ہوتے ہی کہا:

'تو یہ ہے آپ کا عبادت کا کمرہ۔ یہ واقعی جائے تقدیس ہے۔ جی چاہتا ہے کہ سجدے میں گر جاؤں۔ واقعی۔ میں جذباتی نہیں ہو رہی...... آپ کے یہاں روزمرّہ کی زندگی اور عبادت کے لمحے باہم مربُوط نظر آتے ہیں'۔

'ہر وہ عمل جو اللہ کے قانون کے مطابق ہو عبادت کہلائے گا۔ لہٰذا روزمرّہ کی زندگی بھی عبادت قرار پا سکتی ہے؛ دونوں کے لئے الگ الگ دوائر نہیں ہیں اور نہ خانے'۔ برجیس نے کہا

'آپ لوگوں نے مجھے بہت ششدر کر دیا ہے۔ اب مجھ میں تحیّر کی سکت نہیں ہے۔ میری سطح پر آ جائیے، پلیز'، پیٹیشیا کی والدہ کی آواز میں واقعی تحیّر کی کیفیت تھی۔

'اچھا، یہ بتائیے۔ آپ کا وقت کیسے گزرتا ہے۔ آپ کے بچّے تو زیادہ توجہ طلب نہیں کرتے ہوں گے۔ گھر بار کا انتظام بہت قابل ہاتھوں میں نظر آتا ہے اور بچّوں کے چچا میاں اپنے کام میں یکتا نظر آتے ہیں۔ بچّے اُن کو چچا میاں کیوں کہتے ہیں؟'

'اس لئے کہ اُن کی حیثیت ہمارے گھر میں ملازم کی نہیں چچا کی ہے اور اُن کے

والد کو میں بھی چچا ہی کہتا تھا۔ ہماری ہندوستانی تہذیب میں بڑی عمر کے ہر شخص کو چھوٹی عمر کا نام لے کر نہیں پکارنا اور نہ پیشے کے حوالے سے۔ اس کو چچا، تایا، پھوپھا، خالو، نانی، چچی، پھوپھی، خالہ ہی کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اگر آج آپ ہمارے مہمان نہ ہوتے تو چچا، چچی اور اُن کے بچّے ہمارے ہی ساتھ بیٹھ کر کھاتے، روز کی طرح۔ آپ کے احترام میں انہوں نے آج معمول سے گریز کیا ہے۔'

'اوہ! ہماری وجہ سے آج وہ آپ کی محبّت سے محروم رہے۔'

'نہیں۔ آج وہ خود اپنی صحبت سے محظوظ ہو رہے ہوں گے۔ وہ سب مختلف قسم کی نعمتوں سے اُن کے مطابق لطف اندوز ہونا جانتے ہیں اور ماہِ رمضان کا تو تقاضہ ہے کہ ہر طرح کے موقع محل سے عہدہ براہ ہونا سیکھیں ضبطِ نفس کی تربیت بھی ہے۔ وہ برسوں کے تربیت یافتہ ہیں۔' برجیس نے وضاحت کی۔

'آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا، بیگم نادر۔'

'بات کا رُخ دوسری طرف پلٹ گیا تھا۔ میں نے ہندوستان ہی میں M.B.B.S کر لیا تھا۔ لندن میں بچّوں کی تربیت اور تعلیم سے فرصت نہیں تھی۔ پیرس میں آکر طب ماسٹر کیا اور اب دو سال سے طب میں طبّی انسٹی ٹیوٹ کی فیلو شپ حاصل کرنے کی تیاری کر رہی ہوں۔'

'پھر تو آپ میری ایک سہیلی کی دھیوتی کا مسئلہ بھی حل کر سکتی ہیں۔ وہ بھی طب میں ماسٹر ہے اور ایک طب میں ماسٹر سہیلی کی شراکت میں کلینک کھول رکھا ہے، جس میں کام اب اتنا بڑھ گیا ہے کہ دونوں رات گئے تک مصروف رہتی ہیں۔ اُن کے مریض پیرس کے غریب یہودی، عیسائی اور شمالی افریقہ کی فرانسیسی نو آبادی اور مقبوضات کے عرب باشندے ہیں۔ اُن کو اِن عرب مسلمان

مریضوں کے لئے ایک عربی جاننے اور بولنے والی ڈاکٹر کی ضرورت ہے تاکہ اُن کی عورتوں کا اعتماد جیت سکے اور اُن کے مذہبی تعصبات کو سمجھ اور اُن کا لحاظ رکھ سکے۔ اُن کے لئے آپ سے بہتر کوئی دوسرا ہو نہیں سکتا۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اُن کو آپ سے ملانے کے لئے لے آؤں؟ سوچ لیں۔ آپ کی ذمہ داریوں میں یکایک اضافہ ہو جائے گا؟

'ملاقات کرنے میں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر اُن کے ساتھ کام کرنا پسند نہ آیا تو شاید اُن سے دوستی ہو جائے۔ یہ بھی نعمت ہوگی۔ اگرچہ میں یہ چاہوں گی کہ اپنے مسلمان بھائیوں کی خدمت کر سکوں کہ وہ یہاں اجنبی ہیں؟

'آج کی محفل برسوں یاد رہے گی۔ اس کے لئے ہم دونوں آپ کے ممنون ہیں۔ ہم سب کو اجازت دیں۔

'خالہ کو اجازت نہیں مل سکتی۔ وہ برسوں بعد ملی ہیں۔ اُن کو ہمارے یہاں رہنے دیں اُس وقت تک جب تک آپ کو اُن کی سخت ضرورت نہ ہو؟

'یہ معاملہ تو آپ کا اور آپ کی خالہ کا ہے۔ وہ جانیں۔ ہماری طرف سے تو اجازت ہے؟

'خالہ رہ جائیں آپ ہمارے پاس۔ ہمیں آپ سے بہت کچھ کہنا ہے۔ اور آپ سے تو بہت کچھ سُننا بھی ہے؟

'ٹھیک ہے؟

'میں سلویا اور رشیل کو ہفتے عشرے تک لے کر آؤں گی؟

'آپ دونوں عید کے روز شام کے کھانے کے لئے اُن کو لے کر ہمارے مہمان ہوں تو ہمیں مسرت ہوگی۔ ہندوستانی موسیقی کے بہت سے ریکارڈ منگوائے ہیں خاص عید کے لئے بھی انبساط کا سامان مہیا کریں گے اور آپ کے لئے ہندوستان

سے تعارف کا بہت اعلیٰ ذریعہ ثابت ہوں گے۔' برجیس نے کہا۔
'اوہو! ہمیں تو یاد ہی نہیں رہا آپ کو بتانا کہ چند ہفتوں میں ہندوستان کی سیر کو جانے والے ہیں۔ پیٹیشیا ہمارے ساتھ جائے گی۔'
'ضرور جائیں۔ پیٹیشیا اُس ماحول میں اور بھی نکھرے گی۔ شاید وہ ماحول اُس کا منتظر ہے۔ دونوں میں دوستی ضرور ہوگی۔' برجیس بولی
اچھا بھئی، الوداع۔ خدا آپ کے ساتھ ہو۔'

۳

عید رات کو سب نے مل کر گھر کو سجایا، خوشبوؤں میں رچایا۔ عید کے دن نئے کپڑوں میں سب نے نئے روپ دھار لئے، چچا میاں نے کچھ نئے کھانے ایجاد کئے جو مغرب اور ہندی مسلمان تہذیب کے انوکھے امتزاج کا مظہر تھے۔
کھانے کے وقت سے ایک گھنٹہ پہلے مہمان ہمارے یہاں پہنچ گئے۔ بلویا تیکھے نقوش کی ایسی عورت تھی جس کا ایک ایک انگ اپنی جگہ تو حسین تھا مگر دوسرے انگوں کے ساتھ مربوط نہ تھا، جس سے اس کی شخصیت کا اثر بھرپور نہ تھا، اُس میں اِک بکھراپن تھا، جس میں اِک اتھاہ اُداسی تھی۔ اُس اُداسی میں مجھے بہت گہرا کرب محسوس ہوا۔ بچوں نے محسوس کیا کہ جیسے کسی مغربی مصوّر کی کوئی ولیہ کسی تصویر سے نکل زندہ ہوگئی ہو۔
رشیل یہودی حسن کی ایک مبہم ہوتی تصویر نظر آئی، جس کے رنگ اگر شوخ ہوتے تو وہ زندہ محسوس ہوتی اور نظر و قلب کو اِک دھچکا سا لگتا، جیسے کسی نے دونوں پر کمند ڈالی ہو اور دونوں اُس کی لپیٹ میں گرفتار ہوگئے ہوں یکایک۔
کھانے کی میز پر جب مہمان بیٹھے اور کھانے کے قاب بے نقاب ہوئے تو

میں نے محسوس کیا، رِبلویا چونکی ہے، جیسے اُس کو جھٹکا سا لگا ہو۔ اِک بجلی اُس کے اندر لپک گئی ہو۔ پہلے پہل اُس نے کھانا بے دلی سے لیا مگر جلد ہی اُس کے جسم نے مزے کو محسوس کیا اور لطف لیا۔ آہستہ آہستہ جوں جوں کھانے کا مزا اُس میں رچنے لگا تو محسوس ہوا کہ وہ چٹخارے لے رہی ہے، اندر ہی اندر۔ اُس کے ساتھ ساتھ اُس کی آنکھوں میں اِک احساس اُبھرنے لگا، جس کو نام دینے میں مجھے کافی دیر لگی — جیسے اُس کو احساس ہو رہا ہو کہ مزا لے کر اُس نے کوئی گناہ کیا ہو اور اُس پر نادم ہونا چاہ رہی ہو اور کامیاب نہ ہو رہی ہو، باوجود اپنی پوری کوشش کے۔ اِس کے بعد میں نے محسوس کیا وہ اپنے اس احساس سے پیچھا چھڑانے کی کوشش میں کمرے کی اِک اِک شے پر نظر جما جما کر دیکھ رہی ہے، اور اُس کو ہر شے اپنی طرف کھینچ رہی ہے اور وہ اُن سے اپنا پہلو بچانے کی کوشش کر رہی ہے۔ کمرے کی ہر شے یقیناً اہتمام سے چُنی گئی تھی اور سجائی گئی تھی۔ اُن میں اِک حسن تو ذاتی تھا اور دوسرا اُن کو اِک خاص ترتیب اور تزئین کے نظام میں سجانے کا۔ اِس انتظام اور اس نظام اور چیزوں کے ذاتی حُسن سے وہ کافی متاثر نظر آ رہی تھی، لیکن اِس کے ساتھ ساتھ اُس کے اندر احساسِ جمال اور احساسِ کراہت میں اِک عجب کشمکش سی نظر آئی، جس سے وہ لاچار ہوئی چاہتی تھی۔

رشیل اِس طرح کھا رہی تھی جیسے مدّت کے بعد اُس کو، من پسند کھانا میسّر آیا ہو اور اُس کے لئے وہ جسم و جان میں ممنون ہو رہی ہو۔ اور ساتھ ساتھ لذّت کا حظ اُٹھانے میں روح و رواں میں مصروف ہو۔ اُس نے اِک اِک قاب سے ذرا ذرا بار بار لیا اور اِک اک نوالے کا مزا لیا۔ اُس کی آنکھوں سے عیاں تھا کہ وہ مزا لے رہی ہے اور شرما رہی ہے کہ مزا لینے کے احساس کو

چھُپانا چاہتی ہے اور چھُپا نہیں پا رہی۔ کچھ دیر بعد لگا کہ وہ محسوس کر رہی ہے اور اِس پر نادم نہیں ہے۔ اُس کے چہرے کے مدھم نقوش میں رنگ چمکے، اُس کے ماتھے اور رخساروں پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے چمکنے دمکنے لگے، حالانکہ موسم میں بہار کی خُنکی ابھی تازہ تھی۔ وہ لمحے بھر کے لئے بہت ہی حسین لگی اور وہ لمحہ جاوداں ہوا۔

کھانے کے بعد سلویا اور رشیل نے برجیس کو اپنے کلینک کے متعلق بتایا اور اپنے مریضوں اور اُن کے امراض سے اِک سرسری سا تعارف کرایا، جس سے کھُلا کہ پیرس کے غریب ترین علاقے میں واحد کلینک تھا اور اُس علاقے کی ضرورتوں کے مطابق اُس میں توسیع کی بہت حاجت تھی، جو اِس وجہ سے رُکی ہوئی تھی کہ کوئی اچھا ڈاکٹر اس غریب علاقے میں پیرس کے غُربا کے لئے چند ہفتے بھی وقف کرنے کے لئے تیار نہ تھا جبکہ ضرورت اِس کا تقاضہ کرتی تھی کہ کوئی ہو جو اپنی زندگی کے بہت سے ماہ و سال اُن لوگوں کے لئے وقف کر سکے۔ برجیس نے اِس کام میں اشتیاق کا اظہار کیا اور کلینک دیکھنے کی خواہش کی۔ تینوں میں طے ہوا کہ تین دن بعد صبح سویرے سلویا اور رشیل اُس کو کلینک لے چلیں گی۔ چند دن بعد برجیس نے اپنی مصروفیتوں کو اس طرح ترتیب دیا کہ چند گھنٹے شام وہ کلینک کو دے سکے۔ جب اُس نے فیلوشپ کا امتحان پاس کر لیا تو اس نے وہ وقت بھی کلینک میں گذارنا شروع کر دیا جو وہ روز طبی انسٹی ٹیوٹ میں گذارتی تھی۔

کچھ عرصہ کے بعد میں نے محسوس کیا کہ برجیس نے گھر کے بجٹ میں، اپنے لباس میں اِس طرح بچت کرنا شروع کر دی ہے کہ گھر میں کسی کو اس بچت کا احساس نہ ہو اور خاصی بچت ہو جائے۔ یہ بچت اُس نے مریضوں کے لئے دوائیوں کی

صورت خرچ کرنا شروع کردی۔ جن معاملوں میں وہ بچت کرتی میں چپکے چپکے اِس ضرورت کو بحال کرتا رہا۔ آخر ایک دن اُس کو پتہ چل گیا۔ اِس پر ہم دونوں نے طے کیا کہ ہندوستان سے ہمیں جو آمدن ہر ماہ وصول ہوتی تھی اس کا پانچواں حصہ دوائیوں کے لئے مخصوص کر دیا جائے اور میں بھی بر جیس کے ساتھ ہفتے میں تین دن چند گھنٹے مریضوں کے ساتھ گذارا کروں، اُن کی تیمارداری میں، خبر گیری میں، اُن کی جذباتی، ذہنی اور روحانی اصلاح میں، اُن کے ذاتی مسائل حل کرنے میں مدد دینے میں۔ اِس طرح ہم دونوں حاجت مندوں، مساکین، فقراء اور پردیس میں کمانے کے لئے آئے ہوئے عرب مسلمانوں کی زندگیوں میں شریک ہو گئے۔ اِن عربوں میں الجزائری عربوں کی تعداد غالب تھی۔ مراکشی، تیونسی دونوں برابر تعداد میں تھے۔ الجزائری عربوں پر مذہب صرف روایات اور رسومات کی صورت موجود تھا مگر مراکشی تیونسی عربوں پر مذہب کا اثر گہرا تھا۔ اِن دونوں کا الگ الگ قائد ہوتا جو اُن کی مذہبی معاملات میں تعلیم و تربیت کرتا اگرچہ وہ بھی اُن کے ساتھ محنت مزدوری کر کے روزی کماتا تھا۔ یہ قائد کسی مصدقہ صوفی حلقے کی طرف سے مامور ہوتا لیکن اُن کا قائد محض اِس لئے نہ ہوتا تھا، بلکہ یہ منصب اس نے اپنی محنت، اخلاص، پاکبازی اور علم سے حاصل کیا ہوتا۔ اکثر معاملوں میں مراکشی تیونسی لوگوں کے مشیر بھی قائد ہوتے مگر دنیاوی معاملوں، نفسیاتی اور جذباتی معاملات میں کوئی اُن کا مشیر نہ ہوتا کیونکہ وہ احتراماً ایسے معاملات میں اپنے مذہبی قائد کو تکلیف دینے کے تصور سے کتراتے تھے اور اُن کے یہ معاملات اُن کے لئے ہمیشہ مصیبت کا سبب بنے رہتے۔ اُن میں سے اکثر لکھنے پڑھنے سے ناواقف ہوتے۔ خط و کتابت کے لئے اُن کو کسی پڑھے لکھے مراکشی تیونسی طالب علم کی خدمات حاصل کرنے کے لئے اپنے علاقے سے

دُور جانا پڑتا۔ مَیں نے ان معاملات میں اُن کو مشورہ دینے اور اُن کی مدد کرتے رہنے کی پیش کش کی۔ پہلے تو انہوں نے مزاحمت کی۔ جب انہوں نے دیکھا کہ میرا ڈاکٹروں سے رابطہ ہے تو آہستہ آہستہ اُن کی مزاحمت کم ہوتی چلی گئی اور اُن کو مجھ پر اعتبار آتا چلا گیا ہے۔ اور انہوں نے بالآخر مجھ پر اعتماد کرنا شروع کر دیا۔ بعض دفعہ وہ اپنے مذہبی معاملات میں بھی مجھ سے مشورہ کر لیتے۔ آہستہ آہستہ اُن کی دیکھا دیکھی، عیسائیوں اور یہودیوں نے بھی مجھے اعتماد میں لے لیا اور اپنے مسائل میں مجھ سے مشورہ لینے لگے۔ جب اِس سے کلینک اور اُس سے ملحقہ شفعے سے ہسپتال میں مقیم مریضوں میں اِک ضبط ولنسق آتا چلا گیا اور تینوں ڈاکٹر صرف طبّی مسائل کو حل کرنے پر پوری توجہ دینے کے اہل ہو گئے۔ اِس طرح وہ کلینک اور ہسپتال سے گھنٹہ کبھی ڈیڑھ گھنٹہ پہلے فارغ ہونے لگے۔ یہ وقت کبھی سِلوِیا کے گھر، کبھی رشیل کے گھر اور کبھی ہمارے گھر گذرنے لگا۔ دوسرے طبّی اداروں کو بھی ہمارے وجود کا احساس ہونے لگا۔ کبھی کبھی مختلف اداروں کی طرف سے ہمیں مریض بھیجنے لگے۔ بعض اِداروں نے سِلوِیا اور رشیل کو ایک ساتھ کچھ وقت کے لئے اپنا طبّی مشیر بنا لیا اور اُس کے لئے مناسب معاوضہ دینے لگے۔ بعض معاملات میں دونوں برجیس کے پاس بعض مریضوں کو مشورے اور صلاح کے لئے بھجوانے لگے کہ وہ بعض اختصاصی طبّی معاملات میں اُن سے زیادہ سُوجھ بُوجھ، علم اور تجربہ حاصل کر چکی تھی۔ یوں اُن کی شہرت بعض ایسے حلقوں میں پہنچی جن کا غربا اور مریضوں سے دُور کا تعلق بھی نہ تھا۔ اُن حلقوں کے بااثر افراد نے بعض اُلجھے ہوئے طبّی معاملوں میں برجیس سے یا سِلوِیا یا رشیل سے الگ الگ، کبھی بحیثیت بورڈ مشورے لینے کے لئے اُن کے گھر آنا شروع کر دیا اور اس کے لئے معقول معاوضہ پیش

کرتے لیکن تینوں کی کوشش یہ رہتی کہ ایسے با اثر اور متموّل لوگ اُن کے پاس کم سے کم آئیں تاکہ اُن کے کلینک اور ہسپتال کو کچھ وقت کے لئے بھی محروم نہ کرنا پڑے اور نہ ہی ان کی اپنی فرصت کے اوقات کم ہوں۔

جب کبھی ہمارے گھر محفل ہوتی تو اُس میں ہمارے بچّے اکثر شریک ہو جاتے۔ سِلویا کو ہمارے تینوں بچّوں نے موہنے کی کامیاب کوشش کی اور آہستہ آہستہ ہمارے بچّے سِلویا کی جذباتی ضرورت بن گئے۔ وہ فرصت کے لمحات اور تعطیلات ہمارے یہاں گذارنے لگی یا ہمارے بچّے اپنی تعطیلات اُس کے یہاں گذارنے چلے جاتے۔ سِلویا کی نانی بھی اُن کو پسند کرنے لگی اور چاہتی کہ وہ کچھ وقت اُس کے ساتھ بھی گذارہ کریں، چاہے سِلویا گھر پر ہو یا نہ ہو۔ کبھی کبھی ہم بھی اُسے اپنے تہواروں پر بُلاتے اور اِس طرح سِلویا اور اِس کی نانی اور ہمارے خاندان میں گاڑھی چھننے لگی۔

اِسی دَوران میں پیرس کے کتب خانوں، کتب فروشوں، آرٹ گیلریوں، تھیٹروں، میں میری آمد و رفت میں آہستہ آہستہ اضافہ ہوتا چلا گیا کیونکہ کلینک کے مریضوں کے معاملات سُلجھانا کافی صبر آزما اور تھکا دینے والا کام تھا۔ (جس کی کچھ اپنی جاذبیتیں بھی تھیں اور مجھے نظر آنے لگا تھا کہ اس سے میری شخصیت کے اِرتقا میں کافی مدد مل رہی تھی) اس لئے تفریح اور جمالیاتی حظ کی ضرورت بڑھ گئی تھی بعض کتب فروشوں کی دکانوں پر بعض مصنّفین اُدبا اور شعرا سے تعارف بھی ہو گیا تھا اور کبھی کبھی کسی ادبی شعری محفل میں شرکت کا موقع بھی مل جاتا۔ اِسی طرح تھیٹر کے بعض ایکٹروں، ہدایت کاروں، پیشکاروں سے بھی تعلّقات ہو گئے اور اُن سے کسی کیفے، کسی ریستوران میں ملاقات ہو جاتی۔ دوپہر کے کھانے سے کچھ دیر پہلے اور کچھ دیر (کوئی گھنٹہ بھر) بعد تک بالعموم فرصت

ہوتی۔ اس لئے میں شام کو ہسپتال سے فارغ ہونے کے بعد دو تین گھنٹے ان لوگوں کی محفلوں میں شریک ضرور ہوتا اور رات کے کھانے سے ذرا پہلے گھر پہنچتا۔ کبھی کبھی سلویا یا رشیل یا کبھی دونوں موجود ہوتیں اور جب میں پہنچتا تو اس طرح مسکرا کر خوش آمدید کہتیں کہ جیسے اُن کو توقع تو نہ تھی کہ میں اُن کے ہوتے ہوئے گھر آجاؤں گا مگر چونکہ خیر سے بدھو گھر آ ہی گیا تھا تو اُس کو خوش آمدید کہنا لازم تھا۔ کبھی رشیل پوچھ لیتی کہ آج کس ادیب، شاعر، ایکٹر یا ایکٹرس سے میری محفل زیادہ رہی۔ اُس کی آواز اور لہجے میں اس طرح کی ہموار اور یکسانی ہوتی کہ اس میں کسی طنز، کریدیا تفنن کا احساس نہ ہوتا۔ صرف مجھ میں دلچسپی کا اظہار مقصود ہوتا۔ اُس سے کچھ دیر گفتگو ہوجاتی اور ہم اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھاتے اور میں اُن سے رخصت ہو کر اپنے کمرے میں چلا جاتا اور اگر بچے اُن کے پاس نہ ہوتے تو اُن میں سے کسی ایک کے کمرے میں چلا جاتا اور اُس سے کچھ دیر کے لئے باتیں ہوجاتیں۔

ایک رات میں جب گھر پہنچا تو برجیس، سلویا اور رشیل ڈرائنگ روم میں بیٹھی میرے متعلق باتیں کر رہی تھیں۔ جب میں ڈرائنگ روم کے برآمدے میں پہنچا تو میں نے سُنا۔

'نادر علی خان آج خاصی دیر ایسے رہبوں کے ساتھ کیفے دُدُوم میں بڑے استغراق سے محوِ گفتگو پائے گئے۔ یہ صاحب پیرس میں عیسائیت کے بڑے کٹر پرچارک ہیں اور اُن کی خطابت ضرب المثل ہے۔ اُن سے نادر کی دوستی کی تک سمجھ میں نہیں آتی' سلویا کہہ رہی تھی۔

میں کھانے کے کمرے میں کھانا کھانے چلا گیا۔ کھانا کھا کر اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا کہ برجیس نے بُلایا۔ وہ ابھی تک ڈرائنگ روم میں محفل جمائے بیٹھی

تھیں اور اس طرح بیٹھی تھی کہ جیسے رات بھر محفل جمانے کا ارادہ ہو۔ لہٰذا میں نے پوچھ لیا:

'آج کونسل رات بھر محفل جمانے پر تُلی بیٹھی ہے۔ خیر تو ہے؟'

'آپ کا معاملہ زیرِ غور ہے۔'

'الاماں! کیوں؟'

'رسلو یا کہتی ہے کہ ہمارے ساتھ تو کبھی اتنے انہماک اور استغراق سے گفتگو نہیں کی جتنی آج ایبے ریموں سے ہو رہی تھی حالانکہ ہمارا حق اُس پادری پر تو یقینا فائق ہے۔'

'حق تو یقیناً فائق ہے: ہم دوست بھی ہیں اور ہم کار بھی۔ لیکن ایبے ریموں ہمارے بعض عیسائی مریضوں کا مُرشد بھی ہے اور اُن کے حوالے سے مجھے جانتا ہے۔ ہمارا ایک مریض ہے فرانسوآں لے آر۔ وہ تپ دق کا مریض ہے۔ اُس کے کچھ مسائل مَیں نے حل کئے تھے۔ ایک مسئلہ میں جو مشورہ میں نے اُس کو دیا تھا اُس کا ذکر اُس نے ایبے ریموں سے کیا اور ایبے ریموں نے مجھ سے ملاقات کرنے کا اشتیاق ظاہر کیا اور لے آر کے ذریعے سے مجھے کیفے دُودوم میں ملاقات کی دعوت دی۔ لے آر کا مسئلہ یہ ہے: انسانی زندگی میں کرب و بلا کیوں ہیں۔ عام عیسائی تصوّر یہ ہے کہ جب ارض پر انسانوں کے گناہ اِس حد تک بڑھ گئے کہ ان کی اصلاح کا کوئی امکان نہ رہا اور اُن کا صفحۂ ہستی سے مٹ جانا ناگزیر ہوا تو آسمانی باپ کا دل پسیج گیا اور اُس نے طے کیا کہ اپنے اکلوتے بیٹے کو ارض پر بھیجے اور اُس کو انسانوں کے گناہوں کے عوض مصلوب کروا دے تاکہ تمام انسانوں کو نجات مل جائے جب وہ یسوع مسیح کے مصلوب ہونے پر ایمان لے آئیں۔ لے آر کا مسئلہ یہ ہے کہ جب یسوع مسیح کو معلوم تھا کہ

اُس کے لئے مصلوب ہونا مقدر ہے تو پھر وہ صلیب پر کیوں پکار اُٹھا: اے میرے خدا! اے میرے خدا! تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا ہے۔ اور اُس کے آسمانی باپ نے اس کی کوئی مدد کیوں نہ کی، اُس کو تسلّی کیوں نہ دی۔ ایسا ہونا لازم تھا۔ اگر گنہگاروں کے نجات دہندہ کے لئے کرب و بَلا، نوائب و مصائب سے گذرنا ناگزیر تھا تو پھر ہر آدمی کہ گنہگار ہے اور گناہ سے نہیں بچ سکتا، کے لئے کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ اِس ارضی زندگی میں کرب و بَلا نوائب و مصائب سے محفوظ رہے۔ لہٰذا لے آر کا اصرار ہے کہ اُس کو تپدق سے بچایا ہی نہیں جا سکتا اور اِس سلسلے میں سب کوشش فضول ہے۔

میرا مؤقف یہ رہا ہے اور ہے کہ ہر بیماری انسان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے اور اعمال کا تعین ہوتا ہے اُس نظریۂ حیات سے جو ایک انسان اپنے معاشرے اور تہذیب سے، بچپن میں ماں کے دُودھ کی طرح جسم و جان، ذہن و جذبات، قلب و روح میں جذب کرتا رہا ہے یا جس کو خود اپنی کوشش سے، علم سے اپنے لئے وضع کرتا ہے اور اُس کو اپنے قلب و روح میں اُتار لیتا ہے۔ عیسائی نظریۂ حیات اور نظریۂ کائنات کا تقاضہ ہے کہ یہ مانا جائے کہ کائنات کی ہر شئے کے عوامل واجب کے جبر کے تحت متعین ہوتے ہیں۔ عوامل اندھے ہیں اُن میں کوئی حکمت نہیں اور انسان کی زندگی سے بے تعلق اور بے پرواہ ہیں، کیونکہ انسان کائنات ہی کا حصّہ ہے لہٰذا اُس کے اعمال بھی طبعی وجوب کے جبر کے تحت متعین ہوتے چلے جاتے ہیں۔ لہٰذا انسان مجبور ہے کہ اپنے اولین والدین کے گناہ کے سبب گناہ کرے۔ اِس لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ نیکی کر سکے، اچھا بن سکے، کیونکہ اِس دُنیا میں کوئی اچھا نہیں ہے۔ حتیٰ کہ خود یسوع مسیح نے بھی اچھا ہونے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ صرف آسمانی باپ ہی اچھا ہے لہٰذا

اِس نظریۂ حیات اور کائنات کے مطابق نہ تو گناہ سے بچا جا سکتا ہے اور نہ مصائب و نوائب سے۔

اِس سے لازم آتا ہے کہ اِس کائنات اور انسان کا خالق خدا مجبور ہے کہ کائنات کے عوامل کے جبر کو قبول کرے اور اُس نے اِسی لئے اِس کو قبول کرلیا۔ لیکن انسان کی مجبوری کو وہ دیکھ نہ سکا اور اس کا دل پسیج گیا اور اُس کو اپنا اکلوتا بیٹا صلیب پر چڑھوانا اور اس کو صلیب پر بے یار و مددگار چھوڑنا پڑا۔ تاکہ انسانوں کے گناہوں کا کفّارہ ہو سکے۔

اگر کائنات' ارض اور انسان کو خدا نے تخلیق کیا ہے اور وہ ہر شے کے احوال و انجام سے پوری طرح آگاہ ہے۔ تو تخلیق سے پہلے ہی اُس کے علم میں یہ سب کچھ ہونا چاہیئے تھا۔ لہٰذا اُس کو کیا مجبوری تھی کہ وہ ایسی کائنات کو جو انسان کو واجب کے جبر کے تحت مجبور کرتی ہو اور ایسا انسان جو واجب کے جبر کے تابع ہو تخلیق کرتا؟ اور وہ مجبور کیوں تھا؟ کیا وہ ہر شے پر قدرت نہیں رکھتا؟ اگر ایسا ہے تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ اِس سے بڑا خدا بھی ہے جو کائنات' ارض اور انسان کے خالق کو مجبور کر دیتا ہے"!

"یسوع مسیح کا واسطہ ہے رُک جاؤ۔ میرا ایمان اور عقیدہ خراب نہ کرو۔"

اگر تم عیسائی ہو تو یہ عذاب بھی تم کو قبول کرنا ہی ہوگا کیونکہ تم نے اِس کو آواز دے کر بُلایا ہے۔ ایبے ریموں کی بات بھی تم نے کی تھی، تمہارے کہنے پر ہی مجھے یہاں بُلایا گیا اور مجھ سے سوال پوچھا گیا۔ میں نے جو کچھ بتایا ہے سچ بتایا ہے۔ لے آرسے اور ایبے سے بھی اِس معاملے میں گفتگو ہوتی رہی ہے۔ سوال کیا ہے تو اِس کا پورا پورا جواب بھی سُنو۔ اس کا گوارا اور قابلِ قبول ہونا تو لازم نہیں ہے۔

میرے وہم میں بھی نہیں تھا کہ مرے سرسری سے سوال کا جواب ایسا ہوگا جو مجھے وہاں چھیڑے گا جہاں پہلے ہی گھاؤ بہت گہرا ہے۔ مجھے تو آج ہی لے آر کی بیوی نے یہ بات بتائی کہ آپ ایسے ریموں کے ساتھ محو گفتگو تھے۔ وہ کیفے ڈُوڈوم کے باورچی خانے میں ملازم ہے کسی پادری بلکہ مشہور کٹر عیسائی مبلغ اور خطیب سے آپ کا استغراق سے گفتگو کرنا میرے لئے اچنبھے کی بات تھی کہ اُس کی تُک میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ لیکن ہوا یوں کہ آپ کے جواب سے میں بوکھلا گئی اور چلا اُٹھی۔ اس کے لئے میں معذرت چاہتی ہوں۔ اور اس لئے بھی کہ میں نے اپنا گھاؤ اور دُکھ بلا ارادہ آپ کو دکھلا دیا ہے اور نہیں جانتی کہ آپ کے پاس اِس کا مداوا اور مرہم بھی ہے کہ نہیں۔ میں طبیب ہوں اور بے علم بھی نہیں مگر میں اِس کے لئے مداوا ڈھونڈ پائی ہوں نہ مرہم۔ بہرحال آپ کو جواب کا بقیہ حصّہ بیان کرنے سے روکنا نہیں چاہوں گی، چاہے اِس سے میرا گھاؤ چھِل ہی کیوں نہ جائے۔ صلیب پہ چڑھ نہیں سکتی تو اتنا تو کر ہی سکتی ہوں'۔

'آپ طبیب ہیں اور مریضوں کے دُکھ درد کا علاج کرنے کا علم حاصل کیا ہے اور باقاعدہ ایک کلینک اور ہسپتال کھولا ہے۔ اپنے شب و روز کی بیداری کے بیشتر اوقات اِس درد آشنائی اور دُکھ سُدھار پر خرچ کرتی ہیں۔ کیوں؟ کیونکہ ایک سطح پر آپ کو یقین ہے کہ ہر مرض، ہر درد، ہر دُکھ کا علاج اور دوا اور مرہم موجود ہے، تلاش کرنا شرط ہے۔ طب کا پورا علم اِس مفروضے پر کھڑا ہے۔ اِسی سے کائنات کا ایک نظریہ جنم لیتا ہے کہ کائنات کے عوامل میں حکمت ہے، ہر عمل کی ایک منزل ہے جہاں پہنچ کر وہ عمل اپنے آپ کو ایک دوسرے عمل کے سپرد کر دیتا ہے اور منزل در منزل یہ عمل

اور عوامل جاری رہتے ہیں۔ اِسی ایک مفروضے پر سائنس کے سارے علوم ممکن ہوئے۔ کائنات میں قوانین جاری و ساری ہیں اور قانون کی عمل داری ہے۔ ہر شے کی، ہر عمل کی حدود ہیں اور شے کے عوامل اور افعال اِن حدود کو کبھی نہیں توڑتے۔ اِن اشیا اور عوامل اور افعال کے درمیان باہمی ربط و ضبط کے لئے بھی قوانین ہیں اور قوانین کی منازل بھی۔ بے جان مادہ درجہ بدرجہ حیات کی طرف محوِ سفر ہے۔ طبیعیات کیمیا کی طرف، کیمیا حیات کی طرف محوِ سفر ہے۔ نباتات میں بعض درختوں میں نمود و پرورش کے لئے جنسی ربط کا اصول کارفرما ہوتا ہے حالانکہ یہ ایک حیوانی عمل ہے۔ اِسی طرح حیوان میں اختیار کے بہت ہی محدود آثار ملتے ہیں؛ جب انسان حیوان کو رام کر لیتا ہے تو اُن کو بہت سے ایسے اعمال سکھا دیتا ہے جو وہ خود اپنے ارادے اور کوشش سے کبھی نہ سیکھ پائے۔ جب حیوان سے آدم وجود میں آیا تو وہ با اختیار تھا، وہ اپنے آپ کو بنانے، اپنے آپ کو ترقی دینے پر قادر تھا اور پچھلے کئی لاکھ سال میں اُس نے تمدن اور تہذیب کی بے شمار منزلیں طے کی ہیں۔ یہ ارض اُس کے اختیار اور قوتِ تخلیق کی بہت بڑی شہادت ہے۔

اِس کائنات کے علوم سے یہ نتیجہ اخذ کرنا لازم ہے کہ حیات کو خلق کرنے سے پہلے فطرت نے وہ تمام ماحول تیار کر دیا تھا جس میں حیات پنپ سکے، پروان چڑھ سکے، تخلیق کر سکے۔ حیات کو جب اختیار سے نوازا گیا اور آدم وجود میں آیا تو ارضی اور کائناتی ماحول اس کے اختیار اور اُس کی تخلیق کے مواقع کے لئے سازگار تھا۔ کیوں؟ اس لئے کہ کائنات کی تخلیق سے پہلے اُس کے خالق نے طے کیا تھا کہ اس کائنات کے اندر آدم کی تخلیق کی جائے اور وہ انسان کی طرف ارتقا اور ارتفاع کرے، انسان کے بعد فوق الانسان اور احسن التقویم

بنے، اپنے خالق کے اسمار کو اپنے اندر رچائے اور اپنے خالق کے رنگ میں رنگا جائے۔

چونکہ خالقِ ارض وسما نے انسان کو اختیار دینے کا فیصلہ کیا تو لازم آیا کہ وہ اس کی حرّیت اور خود مختاری کا احترام کرے اور اس کو پروان چڑھنے دے۔ لہٰذا اس ارض پر انسان ہی بادشاہ ہے اور تمام مخلوق اُس کے تابع اختیار ہے۔ چونکہ انسان کائنات کا علم حاصل کر سکتا ہے۔ لہٰذا اس کو اپنے قابو میں لاسکتا ہے: کائنات کی کتنی ہی مملکتیں ہیں جو اُس کے اختیار میں آچکی ہیں اور بقیہ پر وہ اپنا اختیار بڑھاتا چلا جاتا ہے۔ لازم آیا کہ یہ صلاحیت اُس کے خالق نے اُس کے اندر ودیعت کرنا طے کی ہو۔

چونکہ آدم اختیار رکھتا ہے اور اپنے اعمال میں آزاد ہے۔ لہٰذا زندگی کے ہر موقع محل میں موجود امکانات میں سے کسی ایک کا انتخاب کر سکنے کا اہل ہے، وہ اپنے اعمال، امکان، خود منتخب کرتا ہے۔ چونکہ وہ ہر شے اور امکان کا پورا پورا علم نہیں رکھتا لہٰذا وہ غلط فیصلہ کر سکتا ہے اور غلط فیصلے پر اصرار بھی۔ اِس لئے اُس کے خالق پر لازم آیا کہ وہ اُس کی ہدایت کا انتظام کرتا۔ اُس نے اپنی ہر مخلوق کے لئے یہ انتظام کیا ہے: ہم دیکھتے ہیں کہ ہر شے کی فطرت مقدّر ہے، جو اُس شے کے ہر عمل کا تعیّن کرتی ہے۔ کہیں ہم اس فطرت کو جبلّت بھی کہتے ہیں۔ یہ ہر شے کے اندر رکھ دی گئی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کی کوئی فطرت نہیں جو اس کے ہر عمل کا تعیّن کرے۔ اُس کو خارج سے ہدایت کی ضرورت رہی ہے اور ہے۔ اِس لئے مختلف اَدوار، مختلف اقوام و ممالک میں خالقِ سما و ارض نے نبی اور رسول بھیجے اور اُن کو کتابِ ہدایت دی تاکہ اِس کو لوگوں تک پہنچائیں؛ جو لوگ اُن کے مشن کو قبول کریں اُن کی مدد اور

تعاون سے کتاب ہدایت کے مطابق ایک معاشرہ تشکیل دیں اور اک حکومت قائم کریں جو کتاب ہدایت کے قوانین کو اپنی قلمرو میں نافذ کرے۔ جب اس ہدایت کے تحت انسان عمل پیرا ہوتا ہے تو اُس کا ہر عمل تخلیق کرتا ہے اور اس کی تخلیقات سے ارض پٹ جاتی ہے، کچ جاتی ہے اور یہ ارض جنت بن جاتی ہے، جہاں کسی انسان کو خوف و حزن نہیں رہتا، اُس کو عزت کی روٹی ملتی ہے، اور ہر انسان کی شخصیت کی زکا اور اُس کا ارتقا ممکن ہو جاتا ہے۔ وہ ایک دوسرے کے سامنے تعاون کرتے ہیں، ہر معاملہ مشاورت سے طے کرتے ہیں، کائنات کے جن جن مظاہر کو مسخر کرتے چلے جاتے ہیں ان کے اثمار کو تمام انسانیت کی فلاح اور اصلاح کے لئے وقف کر دیتے ہیں، پوری کوشش سے کماتے ہیں۔ اپنی کمائی میں سے صرف اپنی حاجتوں کے لئے رکھ کر بقیہ کمائی اُن لوگوں کے لئے کھلا رکھتے ہیں جن کا چلتا کاروبار رُک گیا ہو، معذور ہو گئے ہوں، اپنی پوری کوشش کے باوجود اپنی حاجتوں کے لئے کما نہ سکتے ہوں اور جو اُن کے درمیان مسافر ہوں۔

آپ کہیں گی کہ اگر انسان قوانینِ خداوندی قبول کرتا ہے تو وہ بااختیار کہاں رہا۔ آدم و انسان قوانینِ خداوندی کو قبول کرنے پر مجبور نہیں ہے، وہ اُن سے انکار کر سکتا ہے، اُن کے خلاف عمل پیرا اور برسرِ پیکار رہ سکتا ہے۔ وہ کوئی عمل بھی منتخب کر سکتا ہے۔ مگر وہ اُن اعمال کے عواقب کا تعین نہیں کر سکتا کیونکہ ہر عمل پر کوئی نہ کوئی قانونِ خداوندی لاگو ہوتا ہے۔ کائنات قوانینِ خداوندی کی تابع ہے۔ انسان اپنے اعمال میں آزاد اور با اختیار ہے لیکن اگر وہ اپنے اعمال کے عواقب کا تعین کرنے کا اہل بھی ہوتا تو پھر کائنات میں قانون کی عملداری نہ رہ پاتی، لاقانونیت کا دور دورہ ہو جاتا اور انسان خالقِ کائنات کا حریف بن جاتا اور کائنات انسانی معاشرے کا عکس بن جاتی۔

قانون اور حریّت لازم و ملزوم ہیں، دونوں زوجین ہیں۔ اگر آدم و انسان جانے پہچانے قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ اُن قوانین میں جکڑا جاتا ہے جن سے وہ آشنا نہیں ہے مگر کائنات میں عمل پیرا ہیں۔ اس لئے فلاح اور عذاب، جنّت اور دوزخ انسان کو پُکارتے رہتے ہیں۔

اب یہ انسان کا اختیار ہے وہ کونسا نظریۂ حیات و کائنات قبول کرتا ہے۔ ایسا ہوسکتا ہے کہ انسان باقانون کائنات کو قبول کرلے مگر باقانون حیاتِ ارضی سے انکار کردے۔ وہ کائنات کے عوامل کو مُسخّر کرلے گا مگر اُس کے اثمار اپنے جتھے، قوم، مُلک کے لئے وقف کردے گا اور باقی انسانیت کو غلام بنانے پر تُل جائے گا۔ یوں جنگ ناگزیر ہو جائے گی۔ اگر وہ بے قانون کائنات اور بے قانون حیاتِ ارضی اپناتا ہے تو وہ مجبورِ محض ہو جائے گا اور چونکہ اُس کی فطرت کوئی نہیں ہوگی اس لئے وہ حیوانوں سے بھی بدتر زندگی گذارنے پر مجبور ہو جائے گا کہ آزادی و حُریّت صرف قانونِ خداوندی کو پورے غور و فکر کے بعد دل و جان سے قبول کرنے سے وجود میں آتی ہے۔

کوئی نہ کوئی نظریہ قبول کرنا اس لئے لازم ہے کہ اِس کے بغیر عمل ممکن ہی نہیں۔ یا پھر اس کا ہر عمل کسی غیر شعوری نظرئیے کے تحت وجود میں آئے گا اور اس انسان کی زندگی میں کسی طرح کا تسلسل، کوئی ربط و ضبط، کوئی معنی نہ ہونگے اور نہ ہی اِس کے لئے ممکن ہوسکے گا کہ وہ زندگی کا کوئی منصوبہ بنا سکے کیونکہ اُس کا ہر عمل کسی مختلف مضمر نظریۂ حیات کے تحت غیر شعوری طور پر متعیّن ہوگا۔'

'آپ نے مجھے اپنی زندگی کا چلن بدلنے کے لئے للکارا ہے اور کہا ہے کہ میں اپنے مصائب کی خود ذمّہ دار ہوں، میں نے خود اپنے آپ کو گھائل کیا ہے۔ لٰہذا چیخ و پکار کا حق بھی نہیں رکھتی۔ مجھے اپنے ماضی و حال دونوں کو

زد کرنا ہو گا اور مستقبل کا تعین کرنے کے لئے ایسا نظریہ اپنانا ہو گا، جس کا اطلاق بیک وقت کائنات اور حیاتِ ارضی اور انسان پہلو پر ہو۔ یہ کیسی خوفناک، دہلا دینے والی للکار ہے۔ یہ للکار میرا تعاقب کرے گی۔ اس سے بھاگ کر میں کہاں جا سکوں گی!..... تم میرے دوست ہو کر دشمن؛

'یہ تمہارا تعاقب تبھی کرے گی جب تم اُس کو بُلاؤ گی۔ اس کی طرف توجہ نہ دو گی تو یہ للکار تمہارے کانوں تک نہیں پہنچے گی۔ اس کی زندگی تمہارے ارادے اور فیصلے پر مبنی ہے۔ تم نے فیصلہ کیا تو طب کا علم حاصل کیا۔ اس علم کے عواقب تم نے قبول کئے حالانکہ گریز ممکن تھا لیکن اس تمام کوشش کو فضول قرار دینا ہوتا اور یہ تم نے قبول نہ کیا۔ یہ تمہارا اپنا فیصلہ تھا۔ یہ پیشہ تمہارے لئے اپنانا ضروری نہ تھا۔ رزق تمہیں نانا نانی کی جائیداد سے مل جاتا، ملتا رہتا، مل رہا ہے۔

میں نے تمہارے ہی اعمال میں مضمر اک دوسرے نظریۂ کائنات و حیات کی تصویر کشی کی ہے۔ اس تصویر کے تہہ در تہہ، طبق در طبق، مناظر قبول کرنا یا رد کرنا تمہارا حق ہے۔

میں تمہارا دشمن یقیناً نہیں۔ دوستی کا دعویٰ نہیں کرتا کہ اس کو نباہنے کے لئے پوری زندگی کو داؤ پر لگانا پڑتا ہے اور میری زندگی صرف میری ہی نہیں ہے بلکہ بیوی کی ہے، بچوں کی ہے۔ اُن کی اجازت اور مشورے کے بغیر اس کو داؤ پر نہیں لگایا جا سکتا۔ مگر میں دوستی کے امکان سے انکار بھی نہیں کرتا کہ یہ دوستی امکان کی حدود میں داخل ہوئی ہے؛ قبول کا تقاضا نہیں کیا اُس نے؛ جب کرے گی تو فیصلہ کرنے کا محل ہو گا؛

'جس للکار کا بلویا نے ذکر کیا ہے اُس کی زد مجھ پر بھی پڑتی ہے اس لئے کہ ہر نظریۂ کائنات و حیات کی زد ہر دوسرے ممکن اور ناممکن نظریے پر پڑتی ناگزیر ہے۔

میں باقانونِ کائنات کے تصوّر کو قبول کرتی ہوں کیونکہ میرا علم، میرا پیشہ، میری مہارت، میرا تجربہ اِس کی تصدیق کرتا ہے۔ میں یہ بھی قبول کرتی ہوں کہ اچھے انسان اِس ارض پر ہمیشہ رہے ہیں، ہیں اور رہیں گے۔ لیکن میں یہ بھی مانتی ہوں کہ ایسے انسان کا ہونا ناممکن ہے جس کا ہر عمل خارجی اور اندرونی، اچھا اور خوب ہو۔ خداوند خدا کے چُنے ہوئے بھی ایسے نہیں ہوتے۔ ہم موسیٰ کو ایسا انسان نہیں سمجھتے۔ اِس لئے عیسیٰ کی بات صحیح ہے کہ صرف خداوند خدا ہی اچھا ہے۔ مگر ایسے انسان یقیناً وجود رکھتے ہیں جن کے اچھے اعمال اُن کے بُرے اعمال پر حاوی ہوں۔ انسان خُدا تو نہیں بن سکتا مگر بطور انسان اپنے امکانات میں وہ خوب ہو سکتا ہے اور خوب سے خوب تر کی منزل کی طرف رواں رہ سکتا ہے۔

مگر میں اس بات کو قبول نہیں کرتی کہ خدا انسان کی تلاش نہیں کرتا، اُس کا تعاقب نہیں کرتا اور لہٰذا انسان پر اُس کی محبت فرض نہیں ہے۔ خدا انسان سے محبّت کرتا ہے اور انسان پر اُس کی محبّت واجب اور فرض ہے۔ جب انسان اُس سے محبّت کرے گا تو اُس کا حکم بھی مانے گا۔ اور چونکہ خدا انسان سے محبّت کرتا ہے اور انسان پر فرض ہے کہ وہ خدا سے محبّت کرے تو اس پر بھی یہ لازم آئے گا کہ جس سے خدا محبّت کرے وہ اُس سے بھی محبّت کرے یعنی انسانوں سے محبت کرے۔

محبّت ایک جذبہ ہے۔ اِنسان میں کئی جذبے ہوتے ہیں اور ایسے جذبے بھی ہو سکتے ہیں جس کا ابھی تک انسان نے تصوّر نہیں کیا۔ یہ جذبے تین قسم کے ہو سکتے ہیں: تخلیقی، تخریبی اور جو نہ یہ ہوں اور نہ وہ۔ ہر جذبہ وجود میں اس لئے آتا ہے، اظہار پاتا ہے، کہ انسان کی شخصیّت پیدائش کے وقت نامکمل ہوتی

ہے، غیر ترقی یافتہ ہوتی ہے۔ اور اس میں ترقی کرنے اور مکمل ہونے کی صلاحیت ہوتی ہے اس کو مکمل کرنے کے لئے ساتھیوں کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ یہ ترقی اور یہ تکمیل وحدت بنائے بغیر ممکن نہیں ہوتی اور دوسرا انسان ہی زوج یا Complement بن سکتا ہے۔ لہٰذا جذبات کا اظہار ایسے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی ضرورت کو ظاہر کرتا ہے جو اُس کی شخصیت کو ترقی دینے میں اُس کے مددگار اور معاون اور زوج ہو سکتے ہیں۔ یہ جذبات کا تخلیقی پہلو ہے۔ تخریبی پہلو کے اظہار میں انسان دوسرے انسانوں کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے، بُلاتا ہے تاکہ اُن کو اپنے قابو میں کر سکے، رام کر سکے، مطیع کر سکے، اُن کا استحصال کر سکے، اُن کی شخصیت کو منتشر اور ٹکڑے ٹکڑے کر کے برباد کر دے۔ دوسرے انسان نہ ہوں تو جذبات کی ضرورت ہی نہیں، جذبات کارفرما ہو ہی نہیں سکتے۔ ایسے جذبات بھی ہوتے ہیں جو انسان کو بھلے لگتے، خوشنما لگتے ہیں، اُس کو عمر بھر تک مصروف رکھ سکتے ہیں مگر اُن کا حاصل کچھ نہیں ہوتا۔ نہ خیر نہ شر، جیسے کولہو کا بیل۔

خود انسان کے اندر ہر سطح پر تخلیق اور تخریب کا عمل جاری رہتا ہے جب تک تخلیق کا عمل تخریب پر حاوی رہتا ہے اِس کی شخصیت میں ترقی ہوتی رہتی ہے۔ اور اگر تخریب کا عمل تخلیق کے عمل پر حاوی ہو جائے تو اُس کی شخصیت میں انتشار اور انشقاق آجاتا ہے اور ایسی ٹکڑے ٹکڑے شخصیت کا ہر ٹکڑا دوسرے ٹکڑے سے برسرِ پیکار رہتا ہے۔ یہی کیفیت انسان کی طبیعی سطح پر بھی رہتی ہے تخلیق تخریب پر حاوی ہو تو انسان صحت مند رہتا ہے، جب تخریب تخلیق پر حاوی ہو جائے تو انسان بیمار ہو جاتا ہے، مر جاتا ہے۔ اِسی طرح کائنات میں بھی دونوں عمل بیک وقت جاری رہتے ہیں مگر تخلیق کا عمل ہمیشہ حاوی رہتا ہے۔

لہٰذا کائنات قائم ہے اور اس میں مسلسل اضافے ہوتے چلے جاتے ہیں۔

لہٰذا ظاہر ہے کہ جذبات نامکمل اور غیر ترقی یافتہ انسانی شخصیت کو ترقی دینے اور مکمّل بنانے کے لئے وجود میں آتے ہیں۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ انسان کے غلط فیصلے اور فیصلوں کے سبب جذبات شخصیت کے انتشار اور انشقاق کا سبب بن جائیں۔

جن دو ہستیوں کے درمیان محبّت کا امکان ہے اور اُن کا نامکمّل ہونا اور اِن میں کمیوں کا ہونا لازم ہے۔ جب وہ دونوں محبّت کے رشتوں میں بندھ جائیں یا اپنے آپ کو باندھ لیں تو وہ دونوں ایک وحدت میں جلوہ گر ہو جاتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے زوج بن جاتے ہیں۔ ایک دوسرے کی کمیوں کو پورا کرنے کا لازمی سبب بن جاتے ہیں۔ یہ محبّت کا ایک پہلو ہے۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ رشتہ اخلاقی سطح پر دو کم و بیش برابر شخصیتوں میں ممکن ہے : مالک اور غلام میں ممکن نہیں، دونوں کا آزاد اور خود مختار ہونا لازم ہے۔

چونکہ خدا ہر لحاظ سے مکمّل اور یکتا ہے، اُس کو کسی کی ضرورت نہیں ہے، لہٰذا اُس کا کسی سے محبّت کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اِسی طرح چونکہ انسان خدا کی کسی کمی کو پورا نہیں کرتا کہ وہاں کمی ہے نہیں لہٰذا اُس کا خدا سے محبّت کرنے کا کوئی جواز نہیں، اِسی لئے امکان کوئی نہیں۔ وہ صرف اپنے جیسے انسانوں سے محبّت کر سکتا ہے۔ حتیٰ کہ ماں باپ اور اولاد میں بھی محبّت کا سوال اُس وقت پیدا ہو گا۔ جب ماں باپ اپنی اولاد کو آزاد اور خود مختار، لہٰذا برابر، تسلیم کریں : جذباتی، عقلی اور اخلاقی سطح پر۔ ورنہ اس رشتے کی نوعیت محبّت کی نہیں مالک اور ملکیت کی ہو گی — اِسی سے حفاظت کرنے، قابو میں رکھنے، چمٹے رہنے، چمٹائے رکھنے اور ہر دم ساتھ رہنے اور حکم چلانے اور منوانے

کی خواہش پیدا ہوگی۔ اسی طرح کا رشتہ انسان اور اُس کے پالتو جانوروں
میں ہوتا ہے۔ اُن میں محبّت ممکن ہی نہیں ہوتی۔

خدا نے انسان کے لئے بلا قیمت و بلا مزد جو سامانِ پرورش اُس کی ابتدا سے اس کی انتہا کی ہر منزل میں مہیّا کر رکھا ہے اور اُس کی تخلیق سے پہلے کائنات کی ساخت میں ایسے ماحول کا امکان مدِّ نظر رکھا جس میں انسان کا ارتقا اور ارتفاع ممکن ہو، اُس کو محبّت کا نام نہیں دیا جا سکتا بلکہ وہ خالق کا لازمی فرض قرار پائے گا۔ جو خالق زندگی دیتا ہے اُس پر لازم ہے کہ وہ سامانِ زندگی بھی بلا معاوضہ مہیّا کرے۔ انسان صرف اُسی انسان کو خالق گردانتا ہے جو اپنی تخلیقات کو ایسی زندگی دے دے جو اُس کے وجود کی حاجت سے آزاد ہو۔ ادب، شاعری، مصوری، صورت گری اور موسیقی میں اُسی فنکار کو خالق کہا جاتا ہے جس کی تخلیق اُس کے وجود، اُس کی زندگی سے آزاد ہو جو خود مکتفی ہو۔

ایسے خالق کو رحیم اور رحمٰن اور رب کہا جائے گا۔

اِس کائنات اور اس ارض کا خالق رحیم، رحمٰن اور رب کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے: وہ ہر شے کے اندازے اور حدود مقرر کرتا ہے، کائنات کا انصرام کرتا ہے، اس میں مسلسل اضافے کرتا رہتا ہے اور اپنی کائنات پر پورا پورا کنٹرول رکھتا ہے تاکہ کوئی مخلوق اپنی حدود سے باہر قدم نہ رکھ سکے۔
انسان کی بھی حدود ہیں اگرچہ ہر دوسری مخلوق سے وسیع ہیں۔ اُن حدود کے اندر وہ خود مختار اور آزاد ہے۔ مگر اس کی حیات پر بھی خدا کا نظامِ قانون محیط ہے: وہ زندگی کے ہر مرحلے پر موجود امکانات میں سے کسی ایک کا انتخاب کر سکتا ہے مگر اس امکان کے عواقب کا تعیّن اُس کے اختیار میں نہیں؛

اس کا تعین خالقِ سما و ارض کے قوانین کرتے ہیں۔

لہٰذا خدا اور انسان کا رشتہ حاکم اور مطیع یا باغی کا ہو سکتا ہے، محبت کا نہیں ہو سکتا۔ خود تورات گواہ ہے کہ یہود نے جب قوانینِ خداوند کی اطاعت کی تو وہ اقوامِ عالم میں سرفراز ہوئے اور جب قوانین سے بغاوت کی تو دوسری اقوام کے غلام ہوئے اور جب بار بار کی تنبیہات کے باوجود راہِ راست پر نہ آئے تو خداوند نے اُن کو دُنیا کے ممالک میں تتر بتر کر دیا۔ یہی حال مسلمانوں کا ہوا۔ دونوں نے اپنے اللہ کی اطاعت کی تو دنیا کی اقوام میں سرفراز ہوئے، صدیوں رہے، اور اب ہر جا مغربی ممالک کا اُن پر قبضہ یا تصرف، غلبہ یا اثر ہے۔

اگر انسان آپس میں تعاون کریں اور خدا کے قوانین کی اطاعت کریں تو درد، دُکھ، کرب و بلا، مصائب و نوائب اور آفات کے قبضے سے اُن کی رہائی ممکن ہو جائے اور ارض پر جنّت وجود میں آ جائے۔

خدا کی اطاعت اور انسان اور انسان کے درمیان صلح و آشتی کے لئے صحیح نظریۂ کائنات و حیات بہت ضروری ہے۔ صرف اسی صورت انسان کا جسمانی نظام، نفسیاتی نظام، ذہنی نظام اور تخیّلی نظام صحیح کام کرنے کے اہل ہوں گے۔ جن لوگوں کی شخصیّتوں میں توازن اور اعتدال نظر آئے تو لازم ہے کہ ان کے نظریۂ حیات میں صحت کا عنصر غالب ہو، اگرچہ وہ نظریہ صحیح نہ بھی ہو، بطور طبیب تم جب چاہو اِس اصول کو کارفرما دیکھ سکتی ہو۔ جتنا غلط نظریہ حیات ہو گا اُتنے ہی بڑے مصائب و نوائب اور آفات میں وہ شخص گرفتار ہو گا جس کا وہ شخص حامل ہو گا۔ اِس کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہر بیماری اخلاقی ناکامی اور کمی کے سبب ہے۔ اِسی لئے اللہ قرآن کو قلب کے مرض کے لئے شفا کہتا ہے۔ جب اور جہاں عیسائی نظریۂ حیات کے مطابق جینے کی کوشش کی جائے گی انسان کی

زندگی مسلسل صلیب اُٹھائے گذرے گی اور ہر طرح کے مصائب و نوائب اور آفات اور عذاب کا آنا ناگزیر اور لازم ہو گا کہ اِس نظریۂ حیات میں قانون کی عملداری کے امکان کو تسلیم ہی نہیں کیا جاتا۔ لہٰذا اِس لاقانونیت سے مصائب و نوائب اور آفات ہی وجود میں آسکتے ہیں۔

اِس پر طرہ یہ ہے کہ عیسائیت انسان کے لئے اچھے اور خوب ہونے کے امکان کو تسلیم نہیں کرتی لہٰذا انسان کے لئے گناہ سے بچنا ناممکن ہے۔ اور اس بچنے کے لئے کوئی ترغیب بھی نہیں بلکہ ترغیب یہ ہے کہ بے حدوحساب گناہ کرنے کے باوجود موت سے پہلے اگر یسوع مسیح کے انسانوں کے گناہوں کے کفارے میں مصلوب ہونے پر ایمان لایا جائے تو سب گناہ معاف ہو جائیں گے۔ لہٰذا ہر عیسائی سے مرنے سے پہلے پادری اِس ایمان کا اِقرار کراتا ہے۔ اس لئے گناہ سے بچنے کی کوشش کی کیا ضرورت ہے۔

۴

"اِس کے بعد کئی ہفتے تک ہم تینوں صرف کلینک یا ہسپتال میں پیشہ ورانہ ضرورتوں کے تحت ملتے، پیشہ ورانہ گفتگو کرتے لیکن اِس کے باوجود میں نے محسوس کیا کہ سلویا اور رشیل کے اندر اِک نامعلوم سی تبدیلی آرہی ہے: دونوں کلام کے ایسے مواقع چاہتی ہیں جہاں تنہائی اور فرصت ہو اور صرف میں اُن کے رُوبرُو۔ اِن دونوں سے برجیس کی موجودگی میں جو مکالمہ ہوا تھا اُس کے لئے میں بالکل تیار نہ تھا اور نہیں جانتا تھا کہ اِس طرح کے خیالات میرے اندر اِک لگام کی صورت میں جنم لے چکے تھے اور اظہار چاہتے تھے لیکن جونہی یہ مکالمہ اختتام کو پہنچا تو مجھے احساس ہوا کہ اب ان دونوں سے رشتے کی نوعیت یکدم،

یکسر بدل جائے گی : وہ دونوں جلد یا بدیر میری زندگی سے بالکل نکل جائیں گی یا پھر بھرپور طور پر داخل ہو جائیں گی۔ چلتے پھرتے' لوگوں سے باتیں کرتے' تنہائی میں' کہیں اپنے اندر گہرائی میں اِن میں سے کسی ایک امکان کے لئے اپنے آپ کو تیار ہوتے' راضی ہوتے پایا' اگرچہ کسی ایک کے لئے کوئی خواہش اپنے اندر نہ پائی۔

اِس کے بعد کئی بار ایسا ہوا کہ میں کسی کتب فروش' کتب خانے' آرٹ گیلری' کسی کیفے' کسی ریستوران سے نکل رہا ہوتا تو وہ داخل ہو رہی ہوتیں' وہ نکل رہی ہوتیں تو میں داخل ہو رہا ہوتا۔ مجھے دیکھ کر وہ حیرانی کا' خوشی کا' بے ساختگی سے اظہار کرتیں مگر کسی طرح بات کو طول دینا اور اُن کی محفل میں شرکت کا اظہار کرنا مجھے مناسب نہ لگتا کہ وہ ایک دوسرے میں ڈوبی ہوئی لگتیں۔

ایک دن میں کیفے ڈُوڈوم میں بیٹھا ایک مشہور Persona non grata ادیب سے باتیں کر رہا تھا کہ دونوں کیفے کے دروازے سے اندر داخل ہوئیں صرف اِک دُور کے کونے میں جگہ خالی تھی لہٰذا وہ وہاں جا بیٹھیں۔ میں کافی دیر گفتگو میں مصروف رہا۔ اِس کے بعد وہ ادیب کسی سے ملنے کے لئے چلا گیا تو میں نے دیکھا کہ دونوں میری طرف چلی آ رہی ہیں اور مُسکرا رہی ہیں۔

'اجازت ہو تو ہم بھی آپ کے ساتھ شریک ہو جائیں'

'ضرور'

دونوں میرے رُو برُو خالی کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔

میرے والد آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ ہمارے یہاں آئیں کسی دن بقررہ وقت پر میں آپ کو لے لوں گی'

'میں اب فارغ ہوں کوئی میرے انتظار میں نہیں' کسی سے مجھے ملنا نہیں۔

اگر اِس وقت ملاقات ہو سکے تو چلا چلتا ہوں۔ میرے لئے سعادت کی بات ہوگی۔'

'میرا خیال تھا کہ آپ کسی دوسرے دن کا وقت دیں گے۔'

'بھئی وہ تمہارے والد ہیں اُن کو انتظار نہیں کرایا جا سکتا۔'

'انہوں نے اپنے آپ کو انتظار کرنے کی خاص تربیت دے رکھی ہے کیونکہ اُن کو بہت سی باتوں کا انتظار ہے۔ اور نہیں جانتے کہ کب وقوع پذیر ہوں۔'

'آج، اِس وقت ملاقات ممکن ہے یا نہیں۔'

'آپ دوٹوک بات کیوں کرتے ہیں۔ انتخاب کی اجازت کیوں نہیں دیتے۔'

'میرے اللہ کا یہی حکم ہے اور مَیں نے اپنی تربیت اِس طرح کی ہے کہ اس حکم کی ہمیشہ تعمیل کر سکوں لیکن اِس کا یہ مطلب تو ہرگز نہیں ہے کہ اس وقت ملاقات کرانا آپ پر لازم ہے۔ آپ کسی دوسرے دن کا کوئی وقت مقرر کر سکتی ہیں۔'

'چلیں۔'

جب ہم تینوں رشیل کے گھر پہنچے تو رشیل کے والد گھر کے بیرونی دروازے کا قفل کھول رہے تھے۔

'ابو، نادر علی خان آپ سے ملنے کے لئے آئے ہیں۔'

'مجھے بھی کافی دیر سے گھر پہنچنے کی خواہش رہی تھی۔ بڑی مشکل سے ڈیوٹی سے پیچھا چھڑایا ہے۔ اَب میں سمجھا کہ آپ میری طرف روانہ تھے۔ آئیے۔'

ہم اندر داخل ہوئے۔ اُنہوں نے ڈرائنگ روم تک راہنمائی کی۔ ہم دونوں بیٹھ گئے تو رشیل اور سلویا چلی گئیں۔

'ہمارے گھر میں آپ کے خاندان کے ہر فرد کا ذکر اتنی بار ہوتا ہے کہ میرا احساس ہے کہ مَیں آپ سے مدّتوں سے آشنا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کے گھر میں کتنے کمرے ہیں، ہر کمرہ کس کس استعمال میں ہے، ہر کمرے میں

کیا کیا کچھ ہے ؛ ہر فرد کا مزاج کیسا ہے، اُس کو کیا پسند اور کیا ناپسند ہے۔ میری بیٹی اور سلویا آپ کی بیگم سے بہت گہری محبت رکھتی ہیں۔ وہ ان کے لئے بہن، ماں، باپ، دوست، مرشد اور نہ جانے کیا کیا ہیں۔ اُن سے تو ملاقات کے لئے خود آپ کے یہاں آؤں گا کہ میں جانتا ہوں کہ وہ بطور طبیب بہت ہی مصروف ہیں اور فرصت کے لمحے وہ اپنے گھر میں ہی گذارنا فرض جانتی ہیں بطور طبیب اُن کا بہت شہرہ ہے ؛ نوجوان لڑکیوں کی بیماریوں میں اُن کی مہارت ضرب المثل ہے۔ اکثر آپ لوگوں کا ذکر کچھ اس طرح ہمارے یہاں ہوتا ہے جیسے آپ لوگوں کے اندر جھانک سکتے ہوں، اُن کے خاموش سوالو کا جواب دیتے ہوں، اُن کو اِک رُوحانی مسرت اور قوت دیتے ہوں، جو کہتی ہے کہ زندگی کو خلق کیا جا سکتا ہے، اُس کی صورت گری کی جا سکتی ہے اور ہر انسان اس کا اہل ہے کہ زندگی کے تقاضوں سے عہدہ برا ہو سکے، اپنے آپ سے انصاف کر سکے۔

اِس سے میرا اشتیاق بڑھتا رہا ہے اور مجھے آپ سے پبلک مقام پر ملنے میں یہ قباحت نظر آئی کہ جس قسم کی گفتگو میں آپ سے کرنا چاہتا ہوں وہ جلوتی مقام پر نہیں گھر کی خلوتی فضا ہی میں ہو سکتی ہے۔ میں نہیں چاہتا آپ کی خوشبو گلیوں، بازاروں اور جلوتی مقامات پر اُڑتی پھرے۔ صرف اُن کو اِس خوشبو کے سونگھنے کا حق ہے جو اِس کے اہل ہوں۔ میں اپنے آپ کو اس کا اہل سمجھتا ہوں کہ مَیں نے ایک تہذیب میں جنم لیا، جوان ہوا، بڑھاپے کی آمد کو سُنا؛ دوسری تہذیب میں بڑھاپے کو آتے اور براجمان ہوتے دیکھا؛ اور تیسری تہذیب میں بڑھاپے کو جاتے اور موت کو آتے سُن رہا ہوں۔

میں پیشے کے اعتبار سے ارض شناس ہوں، اِس علم میں ڈاکٹریٹ مَیں نے

سینٹ پیٹرز برگ یونیورسٹی سے لی ؛ انقلاب روس کے بعد لیٹویا میں منتقل ہو گیا اور پھر وہاں سے فرانس چلا آیا۔ بچپن اور لڑکپن میں عبرانی زبان میں توراۃ، تالمود اور اس سے متعلقہ علوم کی تعلیم ملی کہ یہودی نظام تعلیم کا یہی تقاضہ تھا۔ اس کے بعد دوسری تعلیم۔ مذاہب کا تقابلی مقابلہ میرا خاص موضوع رہا ہے۔ سائنسی علوم سے اپنے آپ کو باخبر رکھتا ہوں۔

دو بیٹے انقلاب روس کی نذر ہوئے کہ کمیونسٹ تھے اور میرے ساتھ ہجرت کے لئے تیار نہ ہوئے۔ بیوی لیٹویا میں دفن ہے۔ فرانس میں صرف ایک بیٹی ہی لا سکا۔ یہی اب میرا واحد سرمایہ ہے۔

اس کی زندگی میں آپ کا خاندان اس طرح داخل ہوا ہے کہ اس کے اندر اتنی تبدیلیاں آگئی ہیں، چلی آئی ہیں، کہ مجھے لگتا ہے کہ اگر ان کی رفتار یکساں بھی رہی تو میں کچھ عرصے کے بعد اس کو پہچان نہ سکوں گا۔ میں اپنے گھر میں اجنبی ہو گیا ہوں۔ اس تہذیب میں روزِ ازل سے اجنبی تھا اور اب تک ہوں۔ میں اپنے ہم مذہبوں سے بھی اجنبی ہوں اگرچہ بہت سے لوگوں سے میرے مراسم خاصے گہرے ہیں۔ ان کا عمومی طرزِ عمل اور طرزِ فکر مجھ سے بہت ہی مختلف ہے اگرچہ بچپن میں ہماری تعلیم بالکل ایک جیسی تھی۔

آج میں ڈیوڈ پیاڈوسکی سے کئی گھنٹے محوِ گفتگو رہا مگر میری بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ صیہونی ہے اور میں صیہونیت کا مخالف۔ میری دلیل یہ ہے کہ خداوند خدا نے ہمیں نافرمانیوں کے سبب، بہت سی تنبیہوں کے بعد، دنیا کے ممالک میں تتر بتر کر دیا ہے۔ جب تک ہم اس کی مرضی کے مطابق اپنی زندگیوں کو نہیں ڈھالتے ہماری دوبارہ سرفرازی ممکن نہیں ہے مگر اس کو اور اس جیسے بے شمار یہودیوں کو اصرار ہے کہ دنیا کے حالات اس وقت سازگار

ہیں اور فلسطین میں اُن کی ریاست قائم ہوسکتی ہے اور قائم رہ سکتی ہے۔ میں کہتا ہوں کسی مُلک کا مفاد یہ ہوسکتا ہے کہ فلسطین کے کچھ حصّے میں یہودی ریاست بن جائے مگر اس کی کوئی ضمانت نہیں کہ اِس ملک کا مفاد اِس ریاست کے ساتھ وابستہ رہے۔ یا وہ خود بھی اقتدار میں رہے اور یہودیوں کا پشت پناہ بنا رہے کیونکہ یہودی دُنیا میں اتنے تھوڑے ہیں کہ تمام کے تمام فلسطین میں منتقل بھی ہوجائیں تو بھی فلسطین کے گردوپیش رہ کر، عرب ممالک کے درمیان ہمیشہ اِک اقلیت میں ہی رہیں گے اور فلسطین میں یہودی ریاست عربوں کی سخت ترین مخالفت کے باوجود ہی وجود میں آسکتی ہے۔ لہٰذا اس مخالفت کے باوجود کامیاب ہونا اور رہنا اُسی صورت میں ممکن ہے کہ عرب مختلف ممالک میں بٹے ہوئے ہیں اور اُن میں قوم پرستی رائج کردی گئی ہے، صیہونی لکھتے ہیں عرب متحد نہیں ہیں اور جب تک مُلک پرستی اُن کا شعار ہے وہ متحد نہیں ہوسکتے؛ اِس لئے اُن کے مقابلے میں متحدہ یہودی کامیاب ہوں گے اور رہیں گے۔ اگر ایک پشت پناہ نہیں رہتا تو کوئی دوسرا اُس کی جگہ لے سکتا ہے کہ یہودی اُس مُلک کے کئی مفادات پورے کرسکنے کے اہل ہیں اور ہوں گے، اپنے علم، دولت اور اِتّحاد کے سبب۔

میں کہتا ہوں کہ اگر عرب اور مسلمان متحد ہو گئے تو وہ بہت بڑی طاقت بن جائیں گے اور کوئی قوم اُن کا مقابلہ نہیں کرسکے گی۔ پھر طبقاتِ ارض کا علم بتاتا ہے کہ عرب اور مسلمان ممالک میں اتنی معدنیات زیرِ زمین محفوظ ہیں کہ اُن کا اِتحاد مادی طاقت کا زبردست مظہر بن سکتا ہے۔ اس لئے اُن کی نفرت اور دشمنی مول لینا اپنی تباہی کو آواز دینا ہے مگر صیہونی قائل ہیں کہ عربوں اور دوسرے مسلمانوں میں اتحاد ممکن نہیں کہ وہ اپنے اپنے الگ الگ مُلکی مفاد کو بھول نہیں سکیں گے اور نہ اپنے قومی مفادات، اِسلامی مفادات میں ضم یا اُن کے لئے قربان کرسکیں گے۔

سب سے بڑی بات کہ مسلمانوں اور عربوں کے پاس سائنس کا علم نہیں ہے اور نہ کوئی دوسرا علم جدید۔ اور اُن میں اتنے فرقے ہیں اور اُن فرقوں میں وحدتِ فکر اور وحدتِ جذبات ممکن نہیں۔

آپ کی نظر ان معاملات میں گہری ہے اور میرے علم میں ہے کہ آپ کو مغرب کی کئی زبانوں پر عبور ہے، عربی آپ کی نہ صرف مذہبی زبان ہے بلکہ آپ کو اس پر عبور حاصل ہے اور قرآن پر آپ غور و فکر کرتے رہتے ہیں۔ میں بھی قرآن کو کئی ترجموں میں پڑھ چکا ہوں۔ عبرانی کے حوالے سے میں نے بھی عربی میں شُدبُد حاصل کی ہے جس کو مسلسل مشق سے مہارت بنایا جا سکتا ہے اور اس مہارت کے بل بوتے پر قرآن کے معنی کو سمجھنا آسان ہو جائے گا۔

فلسطین میں میری بیوی کے کئی رشتہ دار آباد ہیں اور اُن سے میری خط و کتابت رہتی ہے ہو سکتا ہے کہ کبھی رشیل وہاں آباد ہونے کی سوچے۔ میں نہیں چاہوں گا کہ وہ وہاں آباد ہو اور میں قبر میں یہ دھڑکا ساتھ لے جاؤں کہ وہ وہاں تباہ ہو جائے گی۔ یہ تباہی مجھے ناگزیر نظر آتی ہے کیونکہ خداوندِ خدا کی مرضی کے بغیر صیہونی فلسطین میں آباد ہونے اور وہاں اپنی ریاست قائم کرنے کے منصوبے تیار کر رہے ہیں۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ یورپ کی طاقتیں دنیا کو ایک بار پھر عالمگیر جنگ میں دھکیل دیں گی اور اس جنگ کے بعد برطانوی سلطنت جزیرہ برطانیہ تک ہی محدود ہو جائے گی۔ لہٰذا صیہونیوں کو برطانیہ کے علاوہ کسی دوسرے کی پشت پناہی ڈھونڈنی ہوگی۔ سیاسی طاقتوں کے مفادات بدلتے رہتے ہیں۔ لہٰذا اِس کی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ جس دوسری طاقت کو وہ پشت پناہ بنائیں وہ یہ کردار ہمیشہ ادا کرتی رہے گی اور عرب اور مسلمان اتحاد کی طرف کبھی نہ لوٹیں گے۔

عربوں کی شکست کے بعد یہودی ریاست قائم ہو سکے گی۔ اور کوئی قوم آج تک اپنی شکست کو بھول نہیں سکی اور انتقام لئے بغیر اُس کو چین نہیں آیا۔ شکست کے بعد عرب نچلے تو نہ بیٹھیں گے، متحد ہونے کی کوشش ضرور کریں گے، دوسرے مسلمان ممالک کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کریں گے کہ کوئی مسلمان اور عرب مُلک اکیلا مغربی طاقتوں کے سامنے کھڑا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اس کی کوئی ضمانت نہیں دے سکتا کہ وہ ناکام رہیں گے۔ جب ترغیب موجود ہو اور محکومی کی ذلت کی تلخی جوان ہو تو انسان اور قومیں بہت کچھ کر گذرتی ہیں۔ اگر یہودی متحد ہو کر ریاست بنا رکھتے ہیں اور اس کو قائم رکھ سکتے ہیں تو مسلمان اور عرب متحد ہو کر اُس کو تباہ کر سکتے ہیں، اور یہ تباہی بہت خوفناک اور دلدوز ہوگی۔

مَیں یہ جاننا چاہوں گا کہ مسلمانوں اور عربوں کا اتحاد اس صدی میں ممکن ہے یا اگلی صدی میں۔ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے تو عرب اور مسلمان ممالک میں کوششیں ہو رہی ہیں اگرچہ وہ فی الحال کمزور ہیں۔ اگر مسلمان اور عرب اقوام نے زندہ رہنا ہے تو اُن کا اتحاد لازم ہے کیونکہ مغربی ممالک کی آبادی دونوں کے برابر ہے اور اُن کی سائنسی اور صنعتی اور تجارتی قوت مستزاد ہے۔ مغربی طاقتیں ان حقائق سے آگاہ ہیں۔ لہٰذا وہ کوشاں ہیں کہ مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ ممکن نہ ہو۔ مگر وہ ہمیشہ تو کامیاب نہیں رہ سکتیں کہ یہ تاریخ کا چلن نہیں ہے!

'مسلمانوں نے قرآن کو عملاً ترک کر دیا ہے۔ اسی لئے اُن کی سلطنت کو زوال آگیا ہے۔ اور بیشتر مسلمان ممالک مغربی طاقتوں کے قبضے، غلبے اور اثر میں ہیں۔ جب تک مسلمان قرآن کی طرف رجوع نہیں کرتے، اُس کو اپنی زندگیوں میں امام نہیں کرتے، اُن کی آزادی اور سرفرازی اور عروج ممکن نہیں۔ میرے اپنے ملک ہندوستان میں بہت سے لوگ قرآن کو دوبارہ مسلمانوں کے لئے ہدایت

بنانے کے لئے کوشاں ہیں۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ کوششیں کب بار آور ہوں۔
اگر اگلے دس بیس سال میں کسی مغربی طاقت نے جنگ کا آغاز کیا تو یہ جنگ عالمگیر ہو جائے گی اور اس جنگ کا نتیجہ یہ ہو گا کہ جس طرح پچھلی جنگ میں جرمن نوآبادیاں ختم ہوئی تھیں اسی طرح برطانوی سلطنت ختم ہو جائے گی۔ ہندوستان اور شمالی افریقہ اور ترکی کے درمیان تمام مسلمان ممالک آزاد ہو جائیں گے۔

فی الحال مجھے فلسطین میں صیہونی ریاست قائم ہوتی نظر آتی ہے کیونکہ یہودیوں کے پاس علم ہے، دولت ہے، اتحاد ہے اور اک نظریہ پر اُن کا اتفاق ہے۔ فلسطین میں یہودی اپنی تعداد کو بڑھائے چلے جا رہے ہیں اور برطانوی حکومت اس عمل کی سرپرستی کر رہی ہے۔ مسلمانوں اور عربوں کے اتحاد کے لئے ضروری ہے کہ یہودی ریاست بنے اور اُس کو اپنی بقا کے لئے وہ تمام حربے استعمال کرنے پڑیں جو ظلم اور تشدد اور اخلاقی اقدار کے خلاف بغاوت پر مبنی ہوں۔ ایسا ہونا ناگزیر ہو گا کیونکہ عربوں کو نکالے بغیر فلسطین میں یہودی ریاست کا قیام ممکن نہیں ہو گا اور اُسے قائم رکھنے کے لئے یہ سب کچھ کرنا لازمی ہو گا۔ کیونکہ مسلمانوں کو قرآن کو عملاً ترک کرنے کی سزا تو ملنی ہی ہے وہ تو ملے گی۔ یہ سزا اُن کو قرآن کی طرف راغب کرے گی کہ محض مادی وسائل اور میکاولی اصولوں کی سیاست سے عرب مسلم اتحاد ممکن نہ ہو سکے گا اور یہ اتحاد صرف قرآن ہی کے قوانین کے تحت قائم ہو سکے گا اور اس اتحاد کے بغیر صیہونی ریاست قائم رہے گی اور کوئی نہ کوئی مغربی طاقت اُس کی پشت پناہ بنتی رہے گی کہ یہ ریاست عرب اور مسلم اتحاد کی راہ میں رکاوٹ بنے گی۔

خود عربوں نے اپنے آپ پر اتنا بڑا ظلم کیا ہے کہ اُس کی سزا ابھی مکمل

ہوتی نظر نہیں آتی، اُن کا جُرم مسلمانوں کے جُرم، قرآن فراموشی سے کس طرح مختلف ہے؟'

'مسلمان قرآن کے متن کو تو بدل نہیں سکتے کہ اُس کی حفاظت کا وعدہ اللہ نے قرآن ہی میں کر رکھا ہے۔ مگر اس کے معنی کو اِس حد تک بدل دیا ہے کہ اصل معنی مسلمان بھول گئے ہیں اور اُن میں معنی کے اختلاف کے سبب بہت سے فرقے بن گئے ہیں اور ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہیں مگر قرآن کے بعض احکام ایسے ہیں کہ اُن کے معنی مسلمان ابھی تک بدل نہیں سکے۔ قرآن کا حکم ہے کہ غیر مسلموں کو اپنا ہم راز اور دوست نہ بناؤ کہ وہ تمہارے دوست ہو ہی نہیں سکتے۔ اور تم کو گمراہ کر دیں گے۔ کسی فرقے نے اس کو نئے معنی نہیں پہنائے بلکہ یوں کہنا مناسب ہے: اِس حکم پر سب فرقے متفق ہیں۔ اِس کے باوجود عربوں نے خلافتِ عثمانیہ کے خلاف برطانیہ اور فرانس کو اپنا ہم راز اور دوست بنایا اور ترکوں کے خلاف بغاوت اور غداری کی حالانکہ ترکوں نے عربوں کو پرتگالی استعمار سے بچانے کی خاطر اُن پر قبضہ کیا اور اُن کو اس صدی کے آغاز کے کچھ عرصہ بعد تک ہر مغربی استعمار سے بچائے رکھا۔ عربوں کے یہی غیر مسلم دوست اور ہم راز اُن پر حاکم ہیں اور اپنے مفاد کی پیروی میں صیہونی ریاستوں کے لئے زمین ہموار کر رہے ہیں۔ جہاں جہاں مغربی استعمار کا عربوں کے یہاں قبضہ ہے وہاں وہ خلافتِ عثمانیہ کے کارناموں کو مٹانے اور ترکوں کو جاہل، ظالم، بددیانت، بے ایمان ثابت کرنے پر کمر باندھے ہے۔ عرب اِن استعماری حاکموں پر اس معاملے میں ایمان لے آئے ہیں کہ یہ قوم پرستی کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔ جہاں جہاں مغربی استعمار کا قبضہ اور نفوذ یا اثر ہے وہاں وہاں اِک الگ عربی زبان کو رواج دیا جا رہا ہے اور وہ دن دُور نہیں کہ عرب ممالک ایک دوسرے کی زبان سمجھ نہ سکیں گے۔

اور کسی استعماری ملک کی زبان میں بات کرنے پر مجبور ہوں گے۔

جب تک عربوں کی موجودہ یا کوئی آئندہ نسل بحیثیتِ مجموعی اِس کا اقرار نہیں کرتی کہ اُن کے آبا نے خلافتِ عثمانیہ سے غدّاری کی اور غیر مسلم استعماری طاقتوں کو ترکوں کے خلاف اپنا ہم راز اور دوست بنایا اور اپنے آبا کے اِس عمل سے قطع تعلق کا اعلان نہیں کرتی اور خلافتِ عثمانیہ کے جانشینوں سے معافی نہیں مانگتی اور آئندہ اسلامی اِتحاد کے لئے دل و جان سے کوشاں رہنے کا تہیّہ نہیں کرتی اُن کی سزا ختم نہیں ہوگی۔ اِس کے علاوہ اُن کو ترکِ قرآن اور قرآن کا پیغام غیر مسلم اقوام تک نہ پہنچانے کی سزا تو مسلمانوں کے ساتھ ملے گی ہی۔ یعنی غیر عرب مسلمانوں کو دوہری سزا ملے گی اور مِل رہی ہے اور عرب مسلمانوں کو تہری سزا ملے گی اور مِل رہی ہے۔'

'تو آپ یہودیوں سے نفرت نہیں کرتے؟'

'اِس کا کوئی جواز نہیں ہے کہ ہم خود اُس راہ پر گامزن ہیں جس پر ہزاروں سال سے یہودی گامزن ہیں۔ انہوں نے اپنے نبیوں سے انحراف کیا اور ہم نے ہزار سال سے عملاً قرآن کو ترک کر دیا ہے اگرچہ زبانی اُس کے اتباع کا اقرار کرتے چلے آئے ہیں۔ اب تو یہودی مسلمانوں سے بہتر ہیں کہ کئی علوم میں اُنہوں نے نام پیدا کیا ہے اور اُن کا بحیثیتِ مجموع اِس بات پر اِتفاقِ رائے ہے کہ فلسطین میں یہودی ریاست قائم کی جائے۔ لٰہذا وہ اپنے علم، دولت اور اتحاد کا فائدہ تو اُٹھائیں گے ہی۔ جب وہ اپنی ریاست کو قائم رکھنے کے لئے مسلسل ظلم کی راہ اختیار کریں گے کہ اِس کے بغیر ریاست کی بقا ممکن ہی نہ ہوگی، تو پھر اُن کے زوال کا آغاز ہوگا مگر اختتام کو تب پہنچے گا جب عرب ممالک قرآن کی طرف رجوع کر چکے ہوں گے اور رجوع میں استحکام آچکا ہوگا۔

اس عرصے میں مسلمانوں کو اپنے آپ کو قرآن پر متحد کرنے کی کوشش کرنا ہوگی ورنہ اُن کا انجام یہودیوں سے مختلف نہ ہوگا اور وہ سطح زمین پر بکھیر دیئے جائیں گے اور جہاں بھی وہ جائیں گے اُن سے اُن ممالک کے لوگ اِس لئے نفرت کریں گے کہ وہ اپنے آپ کو مسلمان کہیں گے اور اپنی آسمانی کتاب قرآن کو مکمل اور آخری وحی قرار دیں گے اور اس پر عمل پیرا نہ ہوں گے۔'

آپ میں حریت اور جرأتِ فکر میرے اندازے سے بہت زیادہ ہے۔ یہ جرأتِ فکر آپ کو مسلمانوں کے درمیان رہنا محال کردے گی۔

'میں جانتا ہوں اور اس کے لئے تیار ہوں اور اپنے اللہ سے ہر دم پناہ طلب کرتا رہتا ہوں۔'

'آپ کی وہ گفتگو مجھ تک حرف بحرف پہنچی ہے جو آپ نے سلویا اور رشیل سے کی کیونکہ وہ ان دونوں کے دلوں پر نقش ہے۔ مجھے اِس سے بحیثیت مجموعی اِتفاق ہے۔ آج کل میں قرآن آپ کی نظر سے پڑھ رہا ہوں .... رشیل مہمان کی خاطر مدارات میں اتنی دیر۔ اب تو بہت ہی اہتمام کروگی تو بات بنے گی۔'

'اہتمام کیا تو ہے۔ دیکھتے ہیں مہمان کو اہتمام پسند بھی آتا ہے کہ نہیں۔ دیر اِس لئے ہوگئی کہ یہ آج ہی ملاقات کے لئے آنے کے لئے تیار ہوگئے جبکہ میرا خیال تھا کہ یہ ملاقات کے لئے کوئی دوسرا دن مقرر کریں گے۔ لہٰذا اس ملاقات کے لئے اہتمام نہیں کیا تھا۔ اب بھاگ دوڑ کے بعد کچھ بات بن گئی ہے۔ آپ دونوں تو باتوں میں اتنے گم تھے کہ ہم سے بالکل بے خبر تھے۔ حالانکہ ہم دروازے پر کھڑے آپ کا انتظار کر رہے تھے۔ اب آپ کو انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔'

'آپ کے دوست کو اپنے خیالات اور اُن کے لئے الفاظ پر بہت قابو ہے۔ اپنی بات پر مکمل یقین رکھتے ہیں اور اس کو مکمل دلائل سے پیش کرتے ہیں۔

اور اس کے باوجود اختلاف کے امکان کو پورے دل و جان سے قبول کرتے ہیں۔ میں بوڑھا نہ ہو گیا ہوتا تو اُن کے دوستی کے لئے طویل سفر پر نکل جاتا۔ مگر اَب ایسا ہونا ممکن نظر نہیں آتا۔ شاید تم اُن کے ساتھ سفر کر سکو، کتنی دُور، یہ میں نہیں کہہ سکتا۔

آئیں۔ لب و دہن اور حلق کو تر کر لیں کہ خشک ہو گئے ہوں گے اور جسم کو خوراک کی حاجت بھی ہو گئی ہو گی اِس طویل گفتگو کے بعد۔'

کھانا کھا کر لوٹے تو بِلوِیا اور رشِیل بھی ساتھ تھیں۔

'اگر اجازت دیں تو اُس گفتگو کو مدِ نظر رکھ کر بات کروں جو بلویا اور رشیل کے ساتھ مصائب و نوائب اور آفات کے حوالے سے عیسائیت اور یہودیت کے بارے میں ہوئی۔'

'ضرور'

'یہ بات تو بحث طلب نہیں کہ انسانی زندگی پر دَرد، بیماری، دُکھ کے علاوہ ایسے مصائب و نوائب اور آفات مسلّط ہو جاتے ہیں جن کا بظاہر انسان کے اعمال سے لازم و ملزوم کا رشتہ نہیں ہوتا اور بظاہر وہ انسان گنہگار بھی نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک نیک شخص ہے جو اکثر لوگوں کے کام آتا ہے اور اپنی ہمت سے بڑھ کر لوگوں کی مدد کرتا ہے، لہٰذا اس کے پاس اپنے لئے اتنا ہی بچتا ہے کہ وہ جسم و جاں کو پیوست رکھ سکے۔ یکایک اس کو ایسی بیماری لگ جاتی ہے کہ وہ دوسرے انسانوں سے الگ کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً تپدق، کوڑھ یا کوئی چھوت کی دوسری اور خطرناک بیماری یا وہ کسی نوجوان لڑکی کے قتل کے الزام میں گرفتار ہو جاتا ہے جبکہ اُس نے قتل نہیں کیا ہوتا مگر حالات و کوائف اِس کی طرف نشان دہی کرتے ہیں اور مقتولہ کے جسم پر نشانات سے

یہ بھی عیاں ہوتا ہے کہ قاتل نے قتل سے پہلے اس سے بہیمانہ جنسی زیادتی بھی کی تھی۔ اِس کے سبب وہ اپنے لوگوں ہی کی نظروں ہی سے نہیں گرجاتا بلکہ جیل میں اپنے ہمسایہ مجرموں کی نظر سے بھی گرجاتا ہے کہ اُس کا ماضی ایک مجرم کا نہیں ہوتا جبکہ اُن کا ماضی جرائم سے عبارت ہوتا ہے۔ اِس کے سبب وہ انسانوں کے درمیان بالکل یکا وتنہا ہوگیا ہے۔ اِس کا سبب کیا ہوسکتا ہے۔

'معاشرے کا غلط نظام جس میں اُس کے معاشی، سیاسی، عدلی اور اخلاقی نظم بھی شامل ہوں گے، جس کے خلاف اُس نے کبھی آواز نہیں اُٹھائی تھی حالانکہ وہ اِن سے آگاہ تھا۔ اِس پر یہ بات مستزاد ہوسکتی ہے کہ اُس کا اپنا نظریۂ کائنات وحیات نہ صرف حقائق سے دُور ہو بلکہ بدیہی غلط مفروضوں پر مبنی ہو'

'اگر ایسا ہو کہ جیل خانے میں اُس کی کلی اخلاقی تنہائی کے سبب اُس کا قلب، اُس کا ذہن، اُس کا تخیل ہر طرح کے جذبے خیال اور مناظر سے خالی ہوجائے اور پھر اُن کے اندر نور داخل ہو اور پھر خدا اور وہ اپنے اندر بالکل بھرپور ہوجائے۔ اِس صورت میں یہ کہنا مناسب نہ ہوگا کہ خدا نے اس کو تمام علائق سے، جذبات سے، خیالات سے، یادوں کے مناظر سے، اس لئے پاک کردیا کہ وہ اُس کے قلب پر اُتر آئے کہ خدا انسان سے محبت کرتا ہے لہٰذا انسان پر بھی لازم ہے کہ وہ خدا سے محبّت کرے اور اپنی مصیبت سے نجات پائے۔

'جب کسی انسان پر انتہائی بے بسی اور مایوسی محیط ہوجاتی ہے، جیسے کہ آپ کی مثال میں مذکور ہے، تو اُس کے اندر سے ہر جذبہ، خیال، احساس مٹ جاتا ہے اور اس کے اندر خلا چھا جاتا ہے۔ کائنات کے پورے نظام میں خلا کا رہنا محال ہے، وہاں دوسرے مقام سے کچھ نہ کچھ کھنچا چلا آئے گا یا

خود خلا میں سے کچھ خلق ہو جائے گا تاکہ خلا کو پُر کرسکے۔ بعینہٖ یہی کیفیت انسان کے اندر کی ہے۔ خلا ہوا اور باہر سے کچھ اندر داخل ہوا یا اندر ہی سے کچھ خلق ہوا۔ اسی لئے مغربی ممالک میں محاورہ ہے کہ خالی ذہن شیطان کا کارخانہ ہے۔ جب انسان پر بے بسی اور مایوسی طاری ہو جائے تو موت کی آرزو جنم لیتی ہے یا اُمید۔ موت کی آرزو سے طبعی یا نفسیاتی یا بعض حالتوں میں روحانی موت واقعہ ہو جاتی ہے : انسان مر جاتا ہے یا خود کار مشین بن جاتا ہے یا شیطانِ مجسم۔

اُمید بھی دو قسم کی ہوتی ہے : سچی اور جھوٹی۔ سچی اُمید صحیح نظریۂ کائنات و حیات ہی سے ممکن ہے اور ایسا نظریہ اس کائنات اور حیات کا خالق ہی دے سکتا ہے، دیتا رہا ہے۔ وہ نبیوں اور رسولوں پر وحی کے ذریعے سے کتاب ہدایت نازل کرتا رہا ہے اور نبی اور رسول اُس کو انسانوں تک پہنچاتے رہے ہیں۔ وحی کو غور و فکر کے بعد دل و جان سے قبول کرنے کی کیفیت کو ایمان کہتے ہیں۔ اس سے قلبِ انسانی امن سے بھرپور ہو جاتا ہے، جو کسی صورت کم نہیں ہوتا اور مستقل ہو جاتا ہے اور ہر صورتِ حال میں ثابت قدمی کا تقاضہ کرتا ہے۔

جھوٹی اُمید کو خود انسان کا تخیّل تخلیق کرتا ہے اور اُس کا وجود صرف انسان کے اندر ہی ہوتا ہے اور اس کا کوئی وجود انسان سے باہر ٹھوس اور محسوس شکل میں نہیں ہوتا۔ اسی لئے وہ وجود باطل ہے، جھوٹ ہے، حقیقت نہیں ہے۔ تخیّل کی تخلیق جب کسی محسوس شکل میں لفظوں، رنگوں، لکیروں، حجموں میں ظاہر ہوتی ہے تو حقیقت کہلاتی ہے اگرچہ اُس کی حقیقت تخلیقِ خدا سے کئی سطحوں پر مختلف اور کم تر ہوتی ہے۔

جب انسان انتہائی بے بسی اور مایوسی کے بعد اپنے اندر محسوس کرتا ہے کہ نور نازل ہو رہا ہے اور خدا اُس کے اندر داخل ہو گیا ہے تو یہ حقیقت نہیں ہے، حق نہیں ہے، کیونکہ اس احساس کا انسان سے الگ، اس سے باہر، ٹھوس حیثیت رکھنا لازم ہے اور ایسے احساس کا خارجی پرتو اور وجود نہیں ہوتا لہٰذا نہ تو یہ نور اصلی ہے، نہ خدا درحقیقت اُتر آیا ہے اور اندر داخل ہوا ہے۔ اِس سے جو احساسِ امن پیدا ہوتا ہے وہ عارضی ہوتا ہے کیونکہ اِس کیفیت پر خارجی دُنیا کا کوئی واقعہ اِس طرح اثر انداز ہو سکتا ہے کہ یہ احساس اور یہ منظر مٹ جائے، لوٹ کر نہ آئے۔

یہ انسان کی تخلیقی قوت ہے جس نے یہ سارا منظر وضع کیا تاکہ اندرونی خلا موت کو نہ بُلا لے اور موت اُس پر حاوی نہ ہو جائے۔ انسان خواب دیکھتا ہے نیند کے دَوران میں، انسان خواب دیکھتا ہے کھُلی آنکھ کے سامنے، انسان خیالات کے جہاں، تخئیل کے جہاں میں بے خود ہو جاتا ہے، اپنے آپ میں نہیں رہتا، زمان و مکان کے احساس سے ماوراء ہو جاتا ہے۔ جھوٹی اُمید سے پیدا ہونے والا اندرونی منظر اِسی نوعیت کی کیفیت ہے؛ اس میں درجہ کا فرق ہو سکتا ہے مگر نوع کا فرق نہیں ہوتا۔ نور کا نزول اور اِنسان کے نفس میں خدا کا دخول ایک ایسا ہی تخئیلی اور واہمی منظر ہے جو انتہائی بے بسی اور نا اُمیدی و مایوسی کا رَد ہے، توڑ ہے ورنہ موت واقعہ ہو جائے۔

کائنات اور حیات اور انسان کا خدا نہ تو انسانوں کے رُوپ میں زمین پر اُتر آتا ہے اور نہ کسی صورت کے اندر داخل ہوتا ہے۔ وہ کائنات سے، لہٰذا انسان سے کہ ارض سے اُگا ہے، ماورا ہے اور کائناتی پیمانوں میں سما نہیں سکتا۔ صورت بھی ایک کائناتی پیمانہ ہے۔ اِنسان بھی اِک صورت ہے اگرچہ

احسن التقویم۔ لہٰذا اُس کے اندر خدا کا نزول اور دخول ناممکن ہے اور اس کا دعویٰ خود فریبی کے سبب ہے۔

یہ اندرونی امن کی کیفیت ان لوگوں میں بھی پیدا ہو جاتی ہے جو خدا کے تصوّر ہی سے منکر ہوتے ہیں اور اُن پر یہ کیفیت اِنتہائی بے بسی اور مایوسی کے بغیر ہی طاری ہو جاتی ہے۔ وہ اِسی امن کی کیفیت کو توجہ ایک نقطہ پر مرکوز کرنے کی کوشش، مشق اور اِسی میں مہارت سے پیدا کر لیتے ہیں۔ بُدھ مت کے مشّاق اور ماہر عامل اور پیروکار اپنے اندر مکمل خلا پیدا کرنے کے بعد نروان کی صورت یہ امن خلق کر لیتے ہیں۔ یہی حال زین بدھ مت میں سارتوری کی کیفیت اور تاؤ مت میں تاؤ کی کیفیت کا ہے۔ حتیٰ کہ غیر متمدن معاشروں کے لوگ خاص پھلوں کا رس پینے سے اِس کیفیت کو اپنے اندر پیدا کر لیتے ہیں۔ یہ سب انسانی تخلیقات ہیں جو خدا کے مختلف قوانین کے مطابق وجود میں آتی ہیں۔ اور ان تجربات کو مختلف تہذیبوں میں دہرایا جا سکتا ہے، حتیٰ کہ مغرب کے سائنسی ماحول میں بھی۔

لہٰذا ایسی کیفیات سے خدا کی انسان سے محبّت کا تصوّر اخذ کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔

میرا تمام علم اُس وحی کو سمجھنے اور اُس کے مطابق عمل پیرا ہونے سے حاصل کیا گیا ہے، جو اللہ کے آخری نبی اور رسول پر نازل ہوئی جو خالقِ سماوارض کے مطابق نظمِ قوانین اور اصولیات کا مکمل نظام ہے اور اس کو غور و فکر، علم و عقل ہی سے سمجھا جا سکتا ہے اور اس ارض پر حیاتِ انسانی کی صورت گری اس نظام کی مدد سے کی جا سکتی ہے۔

اِس وحی کی روشنی اِک ایسی ہی بے بسی اور انتہائی مایوسی کی اِک

دوسری شکل سامنے لاتی ہے۔ اگر یہ کیفیت کسی "نیک" آدمی کی بجائے ایسے آدمی پر وارد ہو جائے جو کسی ضابطہ اخلاق کا پابند نہ ہو تو وہ ایسی حالت میں تشدّد پر اُتر آتا ہے، مشتعل ہو جاتا ہے، آپے سے باہر ہو جاتا ہے، ظلم و ستم پر اُتر آتا ہے۔ انتہائی مایوسی کے اعتبار سے ایسے آدمی کو ابلیس کہیں گے اور تشدد پر اُتر آنے اور ظلم و ستم کرنے کے اعتبار سے اس کو شیطان کہیں گے۔ ابلیس و شیطان، مایوسی اور تشدّد، شخصیت کے دو مربوط پہلو ہیں۔ ابلیس ہی نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا تھا، جب اللہ نے ملائک اور دوسری مخلوق کو ارض پر نئے "خلیفہ" آدم کے اقتدار کو تسلیم کرنے کے لئے کہا۔

فی الحال میں اِس وحی کے حوالے سے بات نہیں کروں گا۔ میں آپ کو کائنات اور ارض کی تاریخ پر غور کرنے کی دعوت دوں گا کہ آپ طبقات الارض کے عالم اور سائنسی علوم پر آپ کی نظر ہے۔ اِس سے ظاہر ہو گا کہ حیات کی تخلیق سے پہلے کائنات اور ارض کے درمیان ایسے رشتے تھے جن کے سبب حیات پنپ سکتی تھی، پروان چڑھ سکتی تھی۔ حیات نے کروڑوں سال میں آدم تک کا سفر کیا اور پھر آدم کی صورت جلوہ گر ہوئی۔ اب تک یہ رشتے برقرار ہیں جب انسانوں نے ارض سے بلند فضا میں اُڑنے کی کوشش کی تو وہ کامیاب ہوئی۔ وہ ارض و کائنات میں موجود ہر شئے کا علم حاصل کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا بلکہ اس علم کے بل بوتے پر وہ ارض و کائنات کی ہر شئے کو مسخر کر سکتا ہے۔ ارض کی بیشتر مملکتوں کو وہ مسخر کر چکا ہے اور بقیہ کو مسخر کرتا چلا جا رہا ہے۔ وہ دن دُور نہیں جب وہ ارض کے کرّے سے باہر خلا میں سفر کرنے کے قابل ہو جائے گا۔ لہٰذا یہ ثابت ہوا کہ وہ ارض و سما کی تسخیر کے لئے اہل بنایا گیا تھا۔ انسان کی تاریخ بتاتی ہے کہ مختلف اقوام کو عروج ملا اور وہ پھر

زوال پذیر ہوئیں، بعض اقوام مٹ گئیں، بعض اقوام ارض کے مختلف ممالک میں تتر بتر ہوئیں، مثلاً یہود۔

دونوں کی تاریخ سے ظاہر ہے کہ کائنات اور ارض اور انسان اُن قوانین کے پابند ہیں جو اُن میں جاری و ساری ہیں۔ اِس لئے علوم سائنس ممکن ہوئے۔ اب انسان سے متعلق علوم وجود میں آ رہے ہیں اور وہ دن شاید دُور نہیں ہے جب یہ علوم سائنس بن جائیں۔ کائنات، ارض اور انسان کے علوم میں یہ نقطہ بار بار سامنے آتا ہے کہ قوانین اندھے نہیں ہیں، اِن میں حکمت ہے اِسی طرح اُن تمام قوانین میں جو انسان نے منکشف کئے ہیں اِن میں ربط اور ضبط ہے اور حکمت ہے۔

ہر علم میں اِک منزل آتی ہے جب وہ دوسرے علم میں بدل جاتا ہے: طبیعات کیمیا میں، کیمیا حیاتیات میں، حیاتیات حیوانیات اور حیوانیات انسانیات میں ارتقا کر جاتی ہے۔ اِس سے بڑھ کر حکمت کا ثبوت اور کیا ہو گا۔ کائنات کا کوئی طبقہ ایسا نہیں ہے جہاں قانون یکساں طور پر جاری و ساری نہ ہو۔ اِس لحاظ سے فطرت میں وحدت اور اِس کے قوانین میں یکسانی ہے۔ یہ وحدتِ خالق کی جامع اور قاطع دلیل ہے۔

اِس طرح انسان کے خیالات، تصورات، جذبات میں قوانین جاری و ساری ہیں۔ کئی قسم کے علوم ریاضی اور کئی قسم کی جیومیٹری منکشف ہو چکی ہے۔ اب تک ارض و سما میں کوئی گوشہ ایسا نظر نہیں آیا جہاں قانون کی عملداری نہ ہو۔ خود طب اِس امر کا ثبوت ہے کہ ہر بیماری کا علاج ممکن ہے، چاہے آج اس علاج کا ہمیں علم ہو یا نہ ہو۔ تلاش کریں تو علاج کا قانون منکشف ہو جاتا ہے۔ یہ حکمت کی مسکت دلیل ہے۔

لہٰذا کائنات کا خالق نہ صرف قوت و اقتدار رکھتا ہے بلکہ علیم و حکیم بھی

ہے۔ چونکہ وہ ہر شے کو ابتدا سے انتہا تک کی منزلیں طے کرانے کے لئے سامانِ پرورش بلا معاوضہ مہیّا کرتا چلا جاتا ہے اس لئے وہ رحیم اور رحمٰن ہے۔ اُس نے انسان کو اختیار اور حریت عطا کی۔ اِس لئے قوانین خداوندی سے انکار ممکن ہے لیکن اِس انکار کے بعد اقرار کی طرف لوٹ آنا بھی ممکن ہے۔ اِس کے لئے قانون ہے۔ اسی لحاظ سے اللہ التوّاب بھی ہے کہ اُس نے واپس لوٹ آنے اور اِقرار کی راہ پر سفر کرنے کو ممکن بنایا۔ یہ اس کی رحمت کی دلیلِ قاطع ہے۔

اِس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ اس انسان کی سُنتا ہے جو اُس کی سُنتا ہے اور اُس کے قانون کی اطاعت کرتا ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں لئے جا سکتے وہ اُس سے محبّت کرتا ہے۔ چونکہ جب وہ اطاعت کرتا ہے تو اُس پر نعمتیں نازل ہوتی ہیں اور جب بغاوت کرتا ہے تو اُس پر مصائب، نوائب اور آفات اور عذاب مسلط ہو جاتے ہیں۔ اِس سے یہ ثابت ہوا کہ انسان کی ساخت ایسی بنائی گئی ہے کہ وہ اللہ کی اطاعت کرے تو اس کا نظامِ بدن اور نظامِ نفس ایسا بہترین کام کرتا ہے اور اس کی اطاعت کا لازمی نتیجہ ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کے ساتھ مِل جل کر ایسا معاشرہ تشکیل دیتا ہے جہاں پر انسان ہر دوسرے انسان کا حامی و ناصر ہوتا ہے اور اِس سلسلے کی ہر ذمہ داری قبول کرتا چلا جاتا ہے۔

اِنسان جب اپنے بدن اور نفس کی ساخت کے بہترین تقاضوں کے مطابق عمل پیرا ہو تو وہ قوانینِ خداوندی کے عین مطابق عمل پیرا ہوتا ہے۔ اِن مختلف قوانین کا علم اور اُن کے باہمی ربط کا علم وہ صرف آزمائش اور غلطی کے تحت حاصل کر سکتا ہے۔ مگر یہ طریق بہت ہی طویل، تھکا دینے والا، تکلیف دہ اور رُلا دینے والا ہے۔ اِس کے برعکس وحیِ الٰہی کے مطابق عمل پیرا ہُوا جائے تو دو تین نسلوں میں معاشرے کی صحیح تشکیل ممکن ہو جاتی ہے۔

اب اگر اجازت دیں تو اِس معاملے میں کچھ باتیں قرآن کے حوالے سے کی جائیں تاکہ خدا اور انسان کے رشتے کی وضاحت ہو جائے؟

'ضرور'

'اللہ نے انسان کو اختیار دیا ہے اور وہ اس اختیار میں دخل اندازی نہیں کرتا۔ اس اختیار اور اس عدم مداخلت کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان سماوارض کی ہر شے کو مسخر کر سکتا ہے۔ چونکہ انسان ارض پر رہتا ہے۔ لہٰذا اس ارض پر موجود مخلوق کا وہی بادشاہ ہے اور اس کا نگران اور محافظ اور رازق۔

جب انسان اللہ کو پکارتا ہے تو وہ اِس پکار کو نہ صرف سُنتا ہے بلکہ اِس پکار کا جواب بھی دیتا ہے۔ وہ سُنتا اسی کی ہے جو اپنی ذات میں زندہ ہے اور زندہ وہی ہے جس نے پیدائش کے ساتھ ملی ہوئی غیر ترقی یافتہ شخصیت کو ترقی دی اور وہ 'میں' کہنے کی اہل ہوئی۔ اللہ کو 'تو' کہنے کا حق اُسی انسان کو ہے جس نے 'مَیں' کہنے کا حق کمایا ہے۔ مگر اللہ ہر پکارنے والے کو براہِ راست جواب نہیں دیتا بلکہ قرآن کے وسیلے سے دیتا ہے کہ یہ اُس کا کلام ہے۔ اگر کسی انسان نے قرآن کو سمجھا ہو قبول کیا ہو اور اس پر عمل پیرا ہو تو اُس انسان کی پکار کا جواب اِس طرح دیا جاتا ہے کہ متعلقہ قرآنی آیت اس کے رُوبرو آجاتی ہے۔ اِس کتاب میں بعض معاملات میں تو مفصّل قوانین دیئے گئے ہیں، مثلاً عائلی زندگی کے بارے میں، وراثت اور دولت کی تقسیم کے بارے میں، ارض کی ملکیت اور اُس سے پیدا ہونے والی اشیا کی تقسیم کے بارے میں، باہمی لین دین کے بارے میں، وضو کے بارے میں۔ بقیہ معاملات کے لئے ایک فلسفۂ قانون اور اصولیات دی گئی ہیں۔ لہٰذا اگر کوئی پکارنے والا اللہ سے کوئی سوال پوچھنا چاہتا ہے تو اُس کو پہلے اپنے سوال کو اصول میں ترتیب

دینا ہو گا تاکہ اُس کو اس کا اُصول جواب میں مل جائے۔

اللہ کائنات میں اور کائنات سے ماوراکسی مقام پر نہیں ہے بلکہ وہ بیک وقت زمان و مکاں سے ماوراء ہے اور انسان سے قریب بھی، اتنا قریب کہ انسان کی شہ رگ سے بھی قریب۔ اُس کے اسما کو سمجھنے کے لئے اپنے ذہن کو مقولات سے آزاد کرانا ہو گا کیونکہ وہ اِن مقولات سے ماوراہے۔ لہٰذا اُس کے اسما پر اُن کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ وہ انسان کو گمراہی اور انکار سے روکتا نہیں کہ ایسا کرنا انسان کے اختیار کو مجبوری میں بدلنے کے مترادف ہو گا۔ اللہ نے اُس کے لئے وحی اور کتابِ ہدایت کے ذریعے سے غلط اور صحیح دونوں راستوں کا تعیّن کر دیا ہے اور اُن کے عواقب سے بھی آگاہ کر دیا۔ لہٰذا یہ انسان کی مرضی ہے کہ وہ دونوں میں سے کونسا راستہ اختیار کرتا ہے۔'

'تو آپ کا مطلب ہے کہ قرآن کے نظامِ حیات کو قبول کئے بغیر خوف و حُزن سے نجات ممکن نہیں۔'

'نہیں۔ یہودیوں کی محنت، علم اور دولت اور اتحادِ باہمی کے باوجود اُن کی ہر جا محکومی اور اُن پر ہر جا ظلم اس بات کا ثبوت ہے کہ اپنے عہد کی وحی سے انحراف کا انجام زوال، محکومیت اور عذاب لازم ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کا باہمی افتراق، جہالت، محکومی اِس بات کا ثبوت ہے کہ ترکِ قرآن سے یہ تمام عذاب لازم آتا ہے۔ اسی قانون کے تحت مغربی اقوام کا سیاسی، معاشی اقتدار، اُن کے معاشروں میں دولت اور آسائشوں کی ریل پیل کے باوجود اُن پر خوف و حُزن کی عمل داری ہے کہ وہاں انسان پر انسان ظلم و ستم کرتا ہے اور وہاں جرائم بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ یہی حال اُن اقوام کا ہے جہاں مغربی اقوام کا قبضہ، غلبہ اور اثر ہے۔ سائنس اِن اقوام کو تسخیرِ کائنات اور ارض

پر تو قادر کر دے گی مگر اُن کو خوف و حُزن سے نجات نہیں دلا سکے گی کیونکہ اُس اقدار نہ وضع کر سکی اور نہ اُن کا انکشاف۔ اقدار ہی سے یہ طے ہو سکتا ہے کہ ہر اِنسان کے حقوق کیا ہیں، دولت اور اقتدار کی انسانوں کے درمیان تقسیم کیسے ہو گی اور ہر شخص کو رزق ذلت سے ملے گا یا عزّت سے۔ اقدار صرف اللہ ہی دے سکتا ہے کیونکہ وہی جانتا ہے کہ انسان کی حدود اور اُس کے امکانات کیا ہیں، اِنسان کے علاوہ دوسری مخلوق کی حدود کیا ہیں اور انسان اور انسان میں، انسان اور دوسری مخلوق میں کیا رشتہ ہونا چاہیئے کہ دونوں سے عدل و انصاف ہو سکے۔ اللہ ہی واضعِ آئینِ حیات ہے اور اُس کے آئین میں کوئی سُقم نہیں؛

'رشیل، بلویا اور میں آپ کی باتوں پر اور قرآن کی تعلیم پر غور و فکر کریں گے۔ اِس کے لئے آپ کا تعاون اور آپ کی دوستی کی ضرورت ہو گی۔ اُمید کریں کہ آپ دوستی کے امکان کو قبول کریں گے؛

'یقیناً۔ قرآن کے مطابق تشکیل پانے والے معاشرے میں بھی دو ملتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ قرآن اُن کے لئے زوجین کی اصطلاح استعمال کرتا ہے جس کو آپ complement کہہ سکتے ہیں۔ غیر قرآنی معاشرے میں تو اِس کی ضرورت اور بھی شدید ہے۔ قرآنی معاشرے میں دوستی نعمت ہے مگر غیر قرآنی معاشرے میں دوستی ہی نعمت ہے؛

۵

"اِس کے بعد رشیل اور بلویا مجھ سے کھُل گئیں اور اُن کے ساتھ کبھی اِکٹھے اور کبھی تنہا کلینک اور ہسپتال سے باہر کبھی بغیر وقت طے کئے اور کبھی

وقت طے کر کے ملاقات ہوتی رہی۔ جب بر جیس اپنی پیشہ ورانہ مصروفیتوں کے سبب سلویا کی نانی کے یہاں محفلوں میں شریک نہ ہو سکتی تو میں بچوں کو وہاں لے جاتا۔ بچے اُس کی نانی کے ساتھ عموماً مصروف ہو جاتے تو ہم دونوں تنہا رہ جاتے۔ یوں رو برو ہو جانے کے سبب خاموشی بھی کلام بن جاتی۔ کبھی بچے سلویا کے ساتھ مصروف ہو جاتے اور میں اور سلویا کی نانی رو برو ہو جاتے۔ ایسے مواقع کے دوران میں اُس نے بتایا کہ اُس کی ایک ہی بیٹی تھی۔ وہ ابھی اسکول ہی میں پڑھتی تھی کہ اُس کا والد الجزائر میں فوج کی کمان کرتا ہوا مارا گیا۔ بیٹی نے اِس کا شدید اثر لیا، اپنے آپ کو تعلیم میں گم کر لیا اور جذبات کے اظہار سے گریز کرنے لگی۔ اُس نے علمِ ریاضی میں شدید دلچسپی لینی شروع کر دی اور اُس میں آخرِ کار ڈاکٹریٹ حاصل کی۔ جن دنوں وہ ڈاکٹریٹ کر رہی تھی تو اُس کے ساتھ ایک لڑکا پڑھتا تھا۔ وہ طبعیات میں ڈاکٹریٹ کر رہا تھا۔ دونوں ریاضی میں دلچسپی کے سبب ایک دوسرے کے قریب آئے اور قربت دوستی میں اور دوستی محبت میں ڈھل گئی۔ دونوں نے شادی کر لی۔ سلویا کی پیدائش کے دوران اُس کی ماں کے جسم میں زہر پھیل گیا جس کے سبب اُس کو بچایا نہ جا سکا۔ سلویا کا والد اس صدمے سے بے حال ہوا اور ہر دم کھویا کھویا رہنے لگا۔ اپنا بیشتر وقت کالج کی لیبارٹری ہی میں گذارنے لگا۔ اکثر رات کو دیر سے لوٹتا۔ ایک دن وہ اپنے کالج سے پیدل ہی چلا آ رہا تھا۔ سامنے سے ایک گھوڑا گاڑی چلی آ رہی تھی۔ اُس نے اُس کو نہیں دیکھا۔ اُس سے ٹکرایا اور اُس کے تلے روندا گیا اور جانبر نہ ہو سکا۔

سلویا کو بے یار و مددگار چھوڑنے کے تصور سے مجھے اتنی وحشت ہوئی کہ میں اپنا دُکھ بھول گئی اور اُس کی پرورش میں لگ گئی۔ سلویا کو بچپن ہی سے

بیمار اور زخمی پرندوں، جانوروں سے والہانہ اُنس تھا۔ وہ جہاں کسی بلی کے بچے، پرندے کو بیمار یا زخمی دیکھتی تو گھر لے آتی اور اُس کا علاج کرتی۔ ہمارے قریب ہی ایک ڈاکٹر رہتے تھے۔ اِس حوالے سے اُن سے اُس کی گاڑھی چھننے لگی۔ وہ اکثر کسی بیمار پرند، زخمی ننھے جانور کو لے کر وہاں پہنچ جاتی۔ جب تک وہ پرندہ یا جانور روبصحت نہ ہو جاتا اس کی تیمارداری اور علاج میں مگن رہتی۔ وہ ضرورت مند اور حاجت مند کی ضرورت بڑے اہتمام سے پوری کرتی۔ اسکول گئی تو کمزور اور غریب بچوں کو اُس کھانے میں شریک کر لیتی جو ہم اُس کو اسکول جاتے ہوئے ساتھ دیتے تھے اور بعض ایسی بچیوں کو وہ ساتھ گھر لے آتی اور اپنے پرانے مگر اچھی حالت میں کپڑے ان کو دے دیتی اور سہ پہر کی چائے میں اُن کو ضرور شریک کر لیتی اور مجھ سے بھی اُن کی مدد کراتی۔ جانور اور پرندوں کے علاج کے سبب اُس کو حیاتیات اور حیوانیات میں گہری دلچسپی ہو گئی۔ اُس نے اسکول اور کالج میں ان میں مہارت حاصل کی۔ بعد میں طب کی طرف رجوع کیا۔

اِس کے ساتھ ساتھ اُس نے یکایک مذہب میں دلچسپی لینی شروع کر دی۔ یسوع مسیح سے اُس کو عشق کی حد تک لگاؤ ہو گیا۔ عہد نامہ جدید اس کو کم و بیش ازبر ہو گیا۔ اُس نے کوشش کرنا شروع کر دی کہ وہ ہر معاملے میں یسوع مسیح کی پیروی کرے۔ اِس معاملے میں مجھ سے کبھی تبادلہ خیال نہ کرتی۔ اِس معاملے میں عیسائیت کے بارے میں کتابیں پڑھتی، پادریوں سے ملتی اور ننوں سے جب کبھی میں اِس بارے میں کریدتی تو وہ کہتی:۔

"نانی اماں! میرا نن بننے کا کوئی اِرادہ نہیں۔ میں ڈاکٹر بنوں گی اور اِس پیشے کو نادار اور مسکین لوگوں کی خدمت کے لئے اپناؤں گی۔ اِس سے

دولت کمانے کی مجھ کو ضرورت نہیں ہے۔ دولت آپ کے پاس ہے۔ اور میرے بوا اب آپ کا کون ہے۔ اِس دُنیا میں دُکھ درد بہت ہیں اور اس کا علاج صرف یہ ہے کہ بہت سے لوگ ایسے ہوں جو طبیب ہوں اور یسوع مسیح کی پیروی میں زندگی گذاریں۔ جب میں طب میں ڈاکٹریٹ کر لیتی ہوں تو ایسے علاقے میں مطب کھولوں گی جہاں صرف نادار اور غریب لوگ رہتے ہوں۔ امیروں کو میری ضرورت نہیں ہے۔"

اس گفتگو کے چند ہفتے بعد وہ اپنی ایک دوست کو گھر لے آئی۔ رشیل سے اُس کی دوستی نے اُس کی دیوانگی میں فرزانگی کا رنگ بھرا، پھر برجیس اور تم سے اُس کی دوستی نے اُس کو وسعت اور بلندی دی اور اُس کی شخصیت میں ایسے پہلو نمایاں ہوئے جس کے آثار اُس کے بچپن اور جوانی میں نہ تھے۔ اب وہ مسکراتی بھی ہے، ہنستی بھی ہے اور کبھی کبھی قہقہے بھی لگا لیتی ہے۔ وہ ادب اور شعر، موسیقی اور تھیٹر میں بھی دلچسپی لینے لگی ہے۔ مجھے کئی بار اوپرا اور تھیٹر لے گئی ہے۔ اب وہ تنہا اور ویران لڑکی نہیں ہے۔ وہ بھرپور عورت ہے جو زندگی کے گرم سرد سے پریشان نہیں ہوتی اور جو بہار سے بھی نہیں گھبراتی۔ میں اس انتظار میں ہوں کہ اُس پر بہار آئے اور وہ کھلے، اس کے چہرے کے فرداً فرداً تیکھے اور متناسب نقوش میں وہ ربط اور وہ رس آئے جس کو حسن کہیں۔ میں اُس کو ماں دیکھنا چاہتی ہوں۔ کون ہوگا جو اس کو ماں بنائے گا۔

تم اور برجیس اُس کے اتنے اچھے دوست ہو۔ اُس کے لئے ڈھونڈو کوئی ساتھی جو اُس کو ماں بننے پر راضی کر لے۔ تم دونوں پر اُس کو انتہا اعتماد ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم دونوں کی دوستی اُس کے لئے خوشیاں لائے گی اور اُس کو زندگی کے بہت قریب لے آئے گی۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ اُس نے

زندگی سے لُطف لینا، اُس سے گداز ہو جانا سیکھ لیا ہے۔ اب اُس کو بیمار اور زخمیوں ہی کی تلاش نہیں، وہ صحت مندوں کو تلاش کرتی ہے اور دوستی کے رشتوں کی اہمیت سے واقف ہو چکی ہے۔ اب وہ بھرپور عورت ہے جس کو ایسے مرد کی ضرورت کا احساس ہے جس کو وہ بھرپور کر سکے اور جو اُس کو اُس کی اگلی منزلوں تک لے چلے، جہاں اُس کی اپنی خوشیاں ہوں اور اپنے غم اور اپنے دکھ

تمہارا خاندان مجھے بہت بھلا لگتا ہے، مجھے بہت بھاتا ہے، مجھے رشک آتا ہے تم پر۔ میں چاہتی ہوں کہ بلویا کا بھی ایسا ہی خاندان ہو۔ تمہارے ذکر بھی تمہیں، پرجیس کو، تمہارے بچوں کو دل وجان سے چاہتے ہیں۔ کاش تم میرے داماد کے نعم البدل ہو سکتے۔ میں تمہاری ممنون ہوں کہ جب بھی تم یہاں آتے ہو تو اس گھر کی ہر شے کھل اُٹھتی ہے؛ خاموشی کلام بن جاتی ہے، اِس گھر کا فرنیچر، اِس کی تصویریں، اُس کے باغ کے پھول بھی کلام کرنے لگ جاتے ہیں۔ اور اک خوف سا میرے دل میں کروٹ لینے لگ جاتا ہے کہ یہ معجزہ کب تک قائم رہے گا، رہ سکے گا۔

اِنسانوں کے درمیان ایسے بھرپور طبق در طبق کھُلتے ہوئے رشتے بہت نادر اور یکتا ہوتے ہیں۔ افسوس کہ اُن کی عمر دراز نہیں ہوتی۔ کاش۔ اُن میں ہمیشگی ہوتی۔

'مسز لوگار، یقین جانیئے یہ رشتے اتنے عارضی نہیں ہوتے۔ یہ زماں کی حدود میں سما نہیں پاتے۔ ان کی زندگی جاودانی ہوتی ہے۔ انسانی ذہن اُن کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ وہ تو قلبِ انسانی کی حدود بھی نہیں چھو سکتا۔ قلبِ اِنسانی میں کئی ابد سما جاتے ہیں۔ یہ محض استعارہ یا تشبیہہ نہیں ہے، امر واقعہ ہے۔ وہ کونسا جذبہ ہے۔ جس نے آپ کو اُن تمام المیوں کو برداشت کرنے

کی طاقت عطا کی۔ آپ کو اپنے میاں، اپنی بیٹی، اُس کے میاں اور سلویا کے باپ سے محبت تھی۔ کتنی محبتیں ہیں جو آپ کے دل میں سما گئیں۔ اب آپ ارشل سے، مجھ سے، برجیس سے، ہمارے بچوں سے محبت کرتی ہیں۔ ایک ہی دل میں یہ محبتیں سما گئی ہیں کہ نہیں۔ جب سلویا کو ماں بنانے والا آئے گا تو آپ اُس سے بھی محبت کریں گی کہ وہ سلویا پر بہار لائے گا اور اس کے بعد آپ سلویا کی اولاد سے محبت کریں گی۔

انسان کی حدود کا اندازہ لگانا محال ہے، اگر ناممکن نہیں ہے۔

سلویا اس منزل کے بہت قریب پہنچ گئی ہے جس کو خود آگاہی کہا جا سکتا ہے۔ اس منزل پر اس پر ایسی سلویا منکشف ہوگی جس کا اُس کو کبھی گمان تک بھی نہ ہوا ہوگا۔ وہ ششدر رہ جائے گی، اِک تحیّر اُس کے اندر جاگے گا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اتنی حیران ہو کہ وہ چِلّائے کہ وہ کیا بن گئی ہے۔ وہ لمحہ اس کے لئے، اس کے دوستوں کے لئے اور شاید آپ کے لئے بہت آزمائش کا لمحہ ہو۔ مگر سلویا کی یہ نئی صورت بہت حسین اور بھرپور اور خوب ہوگی۔ وہ اتنی سطحوں اور ابعاد میں جینے لگے گی کہ اُس کو اپنے آپ پر حیرت ہوگی کہ اس میں اتنی سطحیں اور ابعاد تھے۔

فرحتِ جاوداں ایک بہت ہی انوکھا، عجیب و غریب، تہہ در تہہ، طبق در طبق، جذبہ ہے جس کے لئے انسان کے حواس تربیت یافتہ نہیں ہوتے اور اُس کے نزول سے اُن پر فالج سا گر جاتا ہے اور اگر ذہن اور تخیّل اور قلب مضبوط اور یہ سب آپس میں مربوط اور ہم آہنگ نہ ہوں تو انسان کے دیوانہ ہو جانے کا امکان اور احتمال ہوتا ہے۔

سلویا کا قلب، اُس کا ذہن اور تخیّل مربوط ہوتے چلے جا رہے ہیں

اور اُس کی روح بہت زندہ اور مضبوط ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جب اُس پر یہ لمحہ آئے گا تو وہ اس کے لئے روح کی سطح پر بالکل تیار ہو گی، شاید اس کا ذہن اُس کو قبول کرنے کے لئے کچھ دیر کے لئے مزاحمت کرے۔

اُس کے لئے دُعا کرتی رہا کریں۔ میں اور برجیس اور ہمارے بچّے اُس کے لئے ہر روز کئی بار دُعا کرتے ہیں اور نہ جانے اُس سے صحت یاب ہونے والے کتنے ہی مریض اس کے لئے دُعا کرتے ہوں گے۔

ہم سب دوست سِلویا کے یہاں کرسمس کی رات منانے کے لئے جمع تھے۔ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ دیر سے رات کا کھانا کھایا۔ سِلویا اور رشیل میرے بیٹوں کے ساتھ رقص کرتی رہیں۔ سِلویا کی نانی کے اصرار پر میں اور برجیس، میں اور سِلویا، میں اور رشیل رقص کرتے رہے۔ تھک گئے تو کلاسیکی موسیقی سُنتے رہے۔ اِک خوشی اور مستی کی کیفیت سب پر طاری تھی۔ یکایک احساس ہوا کہ صبح ہوا چاہتی ہے۔ اس احساس کے ساتھ ہی مسز لوگار کے کراہنے اور درد میں چیخنے کی دلدوز صدا نے چونکایا۔ رشیل اور برجیس اُن کی طرف لپکیں۔ سِلویا سکتے میں تھی۔ میں نے اُس کو حوصلہ اور تسلّی دی۔ رشیل کا خیال تھا کہ کھانا ہضم نہ ہوا تھا اس لئے درد تھا مگر برجیس کی تشخیص تھی کہ اپنڈکس کا درد ہے اور اس نے اصرار کیا کہ مسز لوگار کو فوراً ہسپتال منتقل کیا جائے۔ خوش قسمتی سے اس مرض کا ماہر فوراً ہی ٹیلی فون پر مل گیا۔ اُس نے ہدایت کی کہ ہم ہسپتال پہنچیں اور وہ بھی فوراً پہنچ رہا ہے۔ اپریشن ہونے کے فوراً بعد سارا دن اور رات بھر اور اگلی سہ پہر تک مسز لوگار بیہوش رہیں جب ہوش آیا تو موجود ڈاکٹروں نے اُن کو خطرے سے باہر قرار دیا اور تیمار داروں کو آرام کرنے کو کہا۔ سِلویا اور برجیس اور سِلویا کے والد نے مسز لوگار

کے پاس رہنے اور بچے بعد دیگرے جاگنے کا فیصلہ کیا۔ برجیس نے مجھے کہا کہ میں سِلویا کو اس کے گھر لے جاؤں اور اس کو آرام کرنے پر قائل کروں اور خود بھی آرام کر لوں تاکہ اگلی صبح سے ہم دونوں تیمارداروں کو فارغ کر سکیں۔

جب ہم سِلویا کے گھر پہنچے تو اُس نے پانی گرم کروایا اور نہالیا۔ جب وہ نہالی تو وہ تازہ دم تھی اور اُس کے چہرے پر باقاعدہ مسرت تھی اور اُس کے چہرے کے نقوش میں گہرا ربط تھا جس کے سبب وہ پہلی بار حسین محسوس ہوئی۔ اُس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں بھی گرم پانی سے نہالوں۔ جب میں نے بہت لیت ولعل کی تو اُس نے اِس نرمی مگر مضبوطی سے اِصرار کیا کہ اُس کا مشورہ قبول کرتے ہی بنی۔

میں تمہیں بیدار اور تازہ دم دیکھنا چاہتی ہوں، میں تمہارا انتظار کرتی ہوں، خاموشی سے، اطمینان سے، جلدی کی ضرورت نہیں، یہ رات اپنی ہے۔ ملازم سو چکے ہیں۔ ہم ہوں گے اور ہمارے درمیان کلام، پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے تمہیں ورغلانے کا کوئی اِرادہ نہیں۔ مجھ کو اپنے آپ پر قابو ہے اور اعتماد اور تم پر بھی مجھے پورا پورا اعتماد ہے۔

جب میں نہا چکا اور لوٹ آیا تو وہ اِک اکہرے صوفے میں دھنسی بیٹھی تھی۔ اُس کے چہرے پر حُسن محیط تھا، اُس کی آنکھوں میں گہرائی اور جسم پُرسکون۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرائی اور اشارہ کیا کہ سامنے والے اکہرے صوفے میں دھنس جاؤں۔

'میں اپنے ذہن میں، قلب میں، روح میں بہت واضح ہوں کہ جو کچھ میں کہنے والی ہوں وہ ہم دونوں کے قرب اور دوستی کو ایسے موڑ پر لے

آئے گا جو نہ صرف ہم دونوں کی زندگی اور برجیس کی زندگی میں اِک نیا ابعاد پیدا کردے گا بلکہ تمہارے بچوں اور میری نانی کی زندگی میں بھی۔ یہ ابعاد آنے کے بعد ہماری زندگیاں وسیع اور ویران ہوجائیں گی یا بھرپور ہوجائیں گی، یہ میں نہیں جانتی، مگر مجھے اس کا یقین ہے کہ یہ ہوگا ہمیں اتنا عزیز کہ ہم اس کے بغیر زندہ رہنا پسند نہ کریں گے۔

جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے مجھے یہ احساس ہے کہ میں ماں اور باپ سے محروم ہوں۔ میں نے جاننا چاہا کہ کیوں مگر مجھے بچپن میں اس کا جواب نہ ملا۔ میری نانی میرے بچپن میں بھی ادھیڑ عمر تھی اور وہی میری ماں تھی، میرا باپ تھی، میری بہن تھی، بھائی تھی، سہیلی تھی، ہم راز تھی۔ یہ بھی میری سمجھ میں کبھی نہیں آیا کہ اُس نے پہلے اپنے خاوند کی، پھر اپنی اکلوتی چہیتی بیٹی، اُس کے بعد اُس کے خاوند کی موت کو کیونکر برداشت کرلیا اور کیوں؟ وہ اِن صدموں کے تلے دَب کیوں نہ گئی؟ مَر کیوں نہ گئی؟ کیا وہ صرف میرے لئے زندہ رہی؟ کیا انسان کو اپنی موت پر اتنا قابو ہے کہ جب نہ چاہے نہ مرے، جب چاہے مَر جائے؟ مجھے اِس کا جواب بھی کبھی نہیں ملا۔ میں نے اپنی نانی کو کبھی روتے ہوئے نہیں دیکھا، اُس کی آنکھوں میں آنسو بھی نہیں دیکھے۔ اب جب اُس کو اپنڈکس کا دَرد اُٹھا تو اُس کو باقاعدہ، بے محابہ، روتے چیختے اور کراہتے ہوئے سُنا۔ کیا جسمانی درد جذباتی اور ذہنی دُکھ سے زیادہ زوردار ہوتا ہے؟ اُس نے جو رونا اور کراہنا میرے بچپن اور یتیمی کے سبب اپنے اندر برسوں سے دَبائے، چھپائے رکھا تھا اب وہ جسمانی درد کے حوالے سے اندر سے پھوٹ بہا؟ میں غیروں کے دُکھ دَرد کا روز علاج کرتی ہوں مگر اپنی نانی کے لئے کچھ نہ کرسکی، میرے

ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ بر جیس اور ریٔیل موجود نہ ہوتیں تو نہ جانے میری نانی پر کیا بیت جاتی اور جانبر بھی ہو سکتی کہ نہیں۔

جب میں پڑھنے لکھنے کے قابل ہوئی، اسکول جانے لگی تو اسکول کے راستے میں غریبوں کے بعض علاقے اور محلّے پڑتے تھے۔ مَیں نے پہلی بار غریبوں کو دیکھا، بیمار اور بیکار لوگوں کو دیکھا، جو مجھے گھوڑا گاڑی میں جاتے حیرانی سے تکا کرتے —— انہی محلوں اور علاقوں میں مَیں نے پادریوں کو پھرتے، لوگوں کے گھروں میں داخل ہوتے اور اُن سے نکلتے دیکھا اور بعد ازاں انہی گھروں سے جنازوں کو نکلتے دیکھا۔ میرے ذہن میں پادری، موت اور غریبی جڑواں بچّوں کی طرح رہنے لگے۔ جب میں بائبل پڑھنے کے قابل ہوئی تو میں نے پہلے عہد نامہ جدید میں متی، مرقس، اور لوقا کی کتابیں پڑھیں۔ یسوع مسیح کی شخصیت نے مجھے موہ لیا اور میں نے اُس کو اپنا لیا۔ مجھے لگا کہ جیسے مجھے اُن تمام سوالوں کا جواب مِل جائے گا جن کا جواب مجھے بچپن میں نہیں مِلا تھا۔ یہ جواب یسوع مسیح مجھے دے دیگا۔ مگر میرے سوالوں کا جواب مجھے نہ مِلا۔ برسوں بعد جب میں نے یوحنا کی کتاب اور رسولوں کے اعمال اور اُن کے خطوط پڑھے تو میں نے اُن کو اپنے آپ پر طاری کر لیا وہ واقعی میرے اندر رچ بس گئے، اُن کے اکثر حصّے مجھے ازبر ہو گئے پھر مَیں نے عہد نامہ قدیم کی کتابیں پڑھیں۔ اُس کی کہانیوں نے مجھے لُبھایا، حیران کیا، لُطف دیا اور جھنجھلایا اور اکثر مجھے اپنے آپ سے بے خبر کر دیا۔ مجھے صفحوں کے صفحے یاد رہنے لگے۔

مجھے آسمانی باپ کی عظمت اور سطوت اور شوکت بہت مرعوب کرتی مگر جب صلیب پر یسوع نے پکارا "اے میرے خُدا! اے میرے خدا! تو

نے مجھے کیوں چھوڑ دیا" تو مَیں نے محسوس کیا کہ آسمانی باپ اِس دنیا میں نہ تھا، اور بہت دور، بہت ہی دور آسمانوں پر تھا اور شاید یسوع مسیح کی پکار اُس تک نہ پہنچی ہو یا وہ بے بس ہو، مجبور ہو اور اُس نے پکار کو سُننا ہی نہ چاہا ہو۔ چونکہ اُس نے انسانوں کو اُن کے گناہوں سے نجات دلانے کے لئے خود اپنے اکلوتے بیٹے یسوع مسیح کو مصلوب کرانے کا فیصلہ کیا تھا اس لئے اُس نے اپنے اکلوتے بیٹے کی آہ و پُکار کو اپنے کانوں تک نہ پہنچنے دیا اور انتظار کیا کہ یسوع مر جائے تو اُس کو دوبارہ زندہ کر کے آسمانوں پر اُٹھا لے۔ لیکن میری سمجھ میں یہ کبھی نہ آیا کہ جب یسوع مسیح کو معلوم تھا کہ اُس کا مصلوب کیا جانا خود اس کے آسمانی باپ نے طے کیا تھا اور وہ اِس کا اکثر ذکر بھی کیا کرتا تھا کہ اب اُس کے جانے کا وقت آ رہا ہے" تو پھر اُس کو یہ احساس کیوں ہوا کہ اُس کے خدا نے اُس کو چھوڑ دیا؟ وہ کیا توقع کرتا تھا؟ مجھے اکثر یہ احساس ستاتا ہے کہ یہ زندگی اِس لئے ہے کہ انسان گناہ کرے، دُکھ، درد، مصائب و نوائب اُٹھائے اور آفات جھیلے تاکہ وہ مجبور ہو جائے اور اُس کے پاس اِس کے سوا کوئی چارہ نہ رہے کہ وہ اِس پر ایمان لائے کہ یسوع مسیح اُس کو گناہوں سے نجات دلانے کے لئے مصلوب ہوا اور یوں وہ نجات پا جائے۔

مگر مجھے اکثر یہ خیال بھی آتا کہ خداوند خدا نے نوح ؑ کے زمانے میں انسانوں کے گناہوں اور نافرمانیوں سے تنگ آ کر یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ انسانوں کو ارض سے مٹا دے گا اور صرف نوح ؑ کی خاطر کچھ انسانوں کو بچا لیا، مگر اُن انسانوں کی نسل سے جو انسان پیدا ہوئے وہ پہلے انسانوں کی روش پر چل نکلے۔ ایسا کیوں نہ ہوا کہ خداوند خدا نے انسانوں کو مٹا دیا ہوتا اور اُن کی

جگہ کوئی نئی مخلوق خلق کر دی ہوتی جو انسانوں کی طرح نافرمان نہ ہوتی بلکہ اپنے خداوند خدا کی اطاعت کرتی اور اُس سے محبت کرتی اپنے پورے دل سے پورے ذہن اور پوری طاقت سے تاکہ خُدا کو اپنے اکلوتے بیٹے یسوع مسیح کو صلیب کے سپرد نہ کرنا پڑتا۔ کیا وہ اِس پر قادر نہ تھا؟ اگر وہ کائنات جیسی عظیم الشان، پُرہیبت اور پرشکوہ تخلیق کر سکتا تھا جو انسان کی تخلیق سے یقیناً بہت بڑی ہے، تو وہ انسان کی بجائے نئی مخلوق تخلیق کیوں نہ کر سکا۔

یہ ارض، یہ کائنات، انسان سے بے پروا کیوں ہے؟ اس پرواجب کا جبر مُسلّط کیوں ہے اور یہ واجب اندھا کیوں ہے؟ ان سوالوں کا جواب مجھے کوئی کتاب، کوئی انسان نہیں دے سکا۔

مگر یسوع مسیح پر میرا ایمان متزلزل نہیں ہوا۔ فریسیوں اور فقیہوں کو اُس کی ڈانٹ ڈپٹ کرنے کی جُرأت اُس کے علم کی وسعت جو فریسیوں اور فقیہوں کو بے بس کر دیتی، حیران کر دیتی اُن کو جھنجھلا دیتی، حکایات کے ذریعے سے حکمت کی باتیں کرنا اور بے علموں کو سمجھانا، ناداروں، مریضوں، کوہڑیوں، دُنیا کے دھتکارے ہوؤں کو صحت یاب کرنا، اُن کے دل میں اُمید روشن کرنا، اُن کو ظالم کے خلاف کھڑا ہونا سکھانا، مُردے زندہ کرنا، مجھے ہمیشہ ہی بھایا ہے اور اِس سے میری روح کو عجب حرارت، جرأت اور حوصلہ ملا ہے، ملتا رہا ہے۔ اُس کا اور اُس کے حواریوں کا اپنا سب کچھ غریبوں کو دے دینا بہت متاثر کرتا رہا ہے۔

میں نے غریبوں کی حمایت یسوع مسیح سے سیکھی اور میں نے طے کر لیا کہ میں اُس کو اپنی زندگی کا راہنما بنالوں گی۔ مَیں نے اِن کے لئے طب سیکھی اور

اس میں مہارت حاصل کی۔ مَیں نے اُن کی خدمت کے لئے اُن کے علاقے میں کلینک کھولا، اُن کا مُفت علاج کیا اور مَیں نے سمجھا کہ میں نے اپنی زندگی کا بلاوا سُن لیا ہے اور اپنا لیا ہے۔ میں مطمئن تھی اگرچہ بعض سوال مجھ سے جواب طلب کرتے تھے مگر مجھے یقین تھا کہ تجربہ اور علم ایک دن اِن کا جواب مہیا کر دے گا۔

پھر یہ ہوا کہ لیڈی بورن میتھ نے برجیس سے میرا تعارف کرا دیا۔ وہ میرے ساتھ کام کرنے لگی۔ اُس ایسا اطمینان میں نے پہلے کہیں نہ دیکھا تھا، نہ اُس کے بارے میں کہیں پڑھا تھا۔ وہ اتنی بُردبار، اتنی متحمل مزاج، اتنی ہمدرد، اتنی خود مکتفی، اتنی سرسبز، اتنی بھرپور کہ زندگی کے ہر سرد و گرم کو بغیر کسی کشمکش کے قبول کر لیتی ہے اور پھر اُس کی اس طرح صورت گری کرتی ہے کہ اِس صورت میں حُسن، زندگی اور قوت ہوتی ہے، جو اِک قانون کی مطیع ہوتی ہے۔ اور پھر اُس کے بچّے اتنے زندہ، اتنے مربوط، اتنے خود ضابط، مہذّب، محبت آمیز اور محبت بیدار اور اس کے باوجود بچّے، جو خوش رہنا، اُداس ہو جانا، مُسکرانا، ہنسنا اور قہقہہ لگانا جانتے ہیں۔

اور برجیس کے حوالے سے تم میری زندگی میں آہستہ آہستہ، چُپکے چُپکے دبے پاؤں داخل ہو گئے۔ جب تم میری زندگی میں رچ گئے تو مجھے محسوس ہوا کہ کوئی میرے اندر بس گیا ہے اور پھر بھی توجہ طلب نہیں ہے اور مطمئن ہے، اگرچہ انتظار میں ہے۔ پھر تم نے ہمارے ننھے مُنّے ہسپتال میں کام کرنا شروع کر دیا۔ تم مریضوں کے مونس و غم خوار، مشیر اور دوست ہوئے، مرشد و راہ نما ہوئے۔ پھر غریبوں میں تمہارا ذکر عام ہوا، احترام سے، تشکر سے انہوں نے تمہیں اپنی زندگی میں شریک کر لیا۔ پھر اِن غریب مریضوں سے تمہارے

بارے میں میرے کانوں میں پیار کی، دُلار کی باتیں پڑنے لگیں۔ میں تمہاری آمد و رفت کا خیال رکھنے لگی۔ کلینک اور ہسپتال سے فارغ ہونے کے بعد میری نگاہیں تمہیں جانے پہچانے رستوں پر ڈھونڈنے میں مصروف رہنے لگیں۔ تمہیں ڈھونڈنے کبھی کتب فروشوں کی دکانوں، کتب خانوں، آرٹ گیلریوں، تھیٹروں، ریستورانوں کینٹینوں کے شیشوں سے اندر نظریں جانے لگیں۔ تمہاری دلچسپیاں میری دلچسپیاں بنیں، رشید نے میرے اندر ان تبدیلیوں کو محسوس کیا اور میرا ساتھ دینے کے لئے میرے ساتھ شریک رہنے لگی۔ پھر اُس اُس ریستوران، کیفے میں ہم جانے لگے جہاں تم اکثر جاتے تھے۔ اور تمہیں لوگوں، ادیبوں، شاعروں، مصوروں، ایکٹرسوں، ایکٹروں سے باتوں میں محو دیکھنے لگیں اور ہمارا، میرا، دل چاہنے لگا کہ تمہارے رُو برُو بیٹھے ہوں اور باتیں کر رہے ہوں۔ پھر آہستہ آہستہ پرجبیں نے ایسا اہتمام کیا کہ تم کبھی کبھار ہمارے ساتھ بچوں کے حوالے سے شریک ہو جاتے، باتیں کرتے۔ پھر تم نے رات گھر دیر سے آنا شروع کر دیا۔ ہم تمہارے گھر بھی ہوتے تو تم آنے کے بعد کھانے کے کمرے میں چلے جاتے اور وہاں سے بچوں کے کمرے میں اور وہیں سے اپنے سونے کے کمرے میں۔ کبھی میرے یہاں بچوں اور پرجبیں کے ساتھ آتے تو میری نانی اماں ہی کے پاس بیٹھ جاتے اور اُسی سے باتیں کرتے اور اگر محفل میں ہم بھی ہوتے تو ہم سے بھی باتیں ہو جاتیں، مگر ان میں وہ انہماک، وہ استغراق نہ ہوتا، جو اُس گفتگو میں ہوتا جو تم، ریستورانوں کینٹینوں میں ادیبوں وغیرہ کے ساتھ کرتے۔

پھر کسی مریض سے، اُس کی بیوی، بیٹی، لواحق سے ہمیں خبر ملنے لگی کہ تم پادریوں سے ملنے اُن کے گرجوں میں راہبوں سے ملنے اُن کے صومعوں

ہیں، دیکھے گئے ہو۔ کبھی خبر ملتی کہ فلاں محلّے میں، فلاں سڑک پر تم فلاں پادری، فلاں ربّی کے ساتھ ٹہل رہے تھے، باتوں میں مصروف تھے۔ پھر ایک دن میرے اور رشیل کے کانوں تک خبر پہنچی کہ تم ایسے ربیوں کے ساتھ کیفے دُودم میں محفل جمانے لگے ہو۔ چونکہ یہ پادری بہت کٹر عیسائی خطیب سمجھا جاتا ہے اس لئے بہت حیرانی ہوئی۔ اسی رات ہم برجیس سے تمہارے بارے میں گفتگو کر رہے تھے کہ تم گھر پہنچے اور سیدھے کھانے کے کمرے میں چلے گئے اور کافی دیر کے بعد ڈرائنگ روم کی طرف آئے تو تم کو برجیس نے بُلالیا۔ اِس پر تم نے پوچھ لیا کہ محفل رات پھر جمانے کا خیال ہے۔ اِس پر برجیس نے کہہ دیا کہ تمہارا معاملہ زیرِ غور ہے کہ تم ہم سے تو انہماک اور استغراق سے باتیں نہیں کرتے مگر ایسے ربیوں سے کرتے ہو۔ اِس پر تم پھٹ پڑے اور اک سیلابِ خطابت بہہ نکلا۔ تمہاری اُس طویل تقریر کا ایک ایک لفظ میں نے اور رشیل نے سُنا اور دل اور ذہن میں محفوظ کرلیا کہ اِس میں ہمارے بہت سے سوالوں کے جواب تھے جو ہمیں برسوں سے تنگ کر رہے تھے اور یہ جواب ہم دونوں کے طرزِ احساس اور طرزِ فکر کے صریحاً خلاف تھے۔ اتنی تیز اور تند بادِ مخالف کا ہمیں پہلے کبھی سامنا نہ ہوا تھا۔ جب ہم تمہارے یہاں سے رخصت ہوئے تو ہفتوں تک تمہاری تقریر پر غور کرتے رہے اور ہم پر کُھلتا چلا گیا کہ کس حد تک تم ہم سے، ہمارے جذبات، خیالات، احساسات سے آگاہ تھے، جس کے لئے تم نے خاصا غور و فکر کیا ہوگا، اور ہمارے خاموش سوالوں کو سُنا ہوگا اور اُن کے جوابات تلاش کرنے کے لئے ذہنی اور جذباتی صعوبتیں اُٹھائی ہوں گی۔ اِس احساس سے ہمیں بھلی بھلی سی حرارت ملی جو قلب و ذہن میں رچتی چلی گئی اور احساس دِلانے لگی کہ اگرچہ تم نے ہمارے

ساتھ کبھی پیرس کی گلیوں اور سڑکوں اور پارکوں میں سفر نہیں کیا تھا، ٹہلے نہیں تھے، مگر پھر بھی ہمارے ساتھ ساتھ چلتے رہے ہو، ہمارے اندر جھانکتے رہے ہو، ہماری ذوات سے تمہاری گہری دوستی رہی ہے اور ہے۔

پھر رشیل نے، کہ اکثر اپنے والد سے تمہارا اور برجیس کا ذکر کرتی رہتی تھی، اِس طویل تقریر کا ذکر کیا اور ہفتوں میں اور رشیل، اُس کے والد کے ساتھ مل کر اس پر غور کرتے، تبادلۂ خیال کرتے، اُس کو سمجھتے، قبول یا رد کرنے کی کوشش میں طویل محفلیں برپا کرتے رہے ہیں۔ آخر ایک دن رشیل کے والد نے تم سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کردیا اور تم آئے اور تم دونوں میں اِک طویل مکالمہ ہوا اور اس میں اتنے محو ہوئے کہ جب ہم ڈرائنگ روم کے دروازے تک پہنچے تو مکالمہ اپنے نقطۂ عروج پر تھا اور تم دونوں اِس میں بالکل گم تھے۔ لہٰذا ہم ٹھٹکے اور دروازے پر رُکے رہے، دم بخود، اور ہم نے تمہاری گفتگو کا آخری حصہ سُنا، اگرچہ تم دونوں کو بالکل احساس نہ ہوا کہ ہم موجود ہیں اور سُن رہے ہیں۔

اِس کے بعد برجیس نوجوان لڑکیوں کے امراض کے علاج میں مصروف رہنے اور کھوئی رہنے لگی یا اُس نے اپنے آپ کو مصروف کرلیا اور پھر ہم دونوں کبھی کبھی ساتھ ساتھ، کبھی تنہا تنہا تم سے مِلنے لگے۔

رشیل نے محسوس کیا کہ اس نے جو بھائی انقلاب روس میں کھو دیئے تھے وہ تمہاری صورت اُس کو مل گئے ہیں۔ میں نے پہلے پہل محسوس کیا تم نے میرے دل میں میرے باپ کی جگہ لے لی ہے، تم میرے لئے میرے مرحوم باپ بن گئے ہو، زندہ ہو گئے ہو، مجھ پر شفقت کرنے لگے ہو، مجھ سے پیار کرنے لگے ہو۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ تم میں میری ماں بھی زندہ ہو گئی ہے حالانکہ میں نے

اس کی صرف تصویریں ہی دیکھی ہیں، اُس کے بارے میں باتیں ہی سُنی ہیں پھر میں نے محسوس کیا تم میرے بڑے بھائی ہو حالانکہ میں نہیں جانتی کہ بھائی بہن کے لئے کیا ہوتا ہے، اگرچہ سکول میں اپنی سہیلیوں سے اُن کے بھائیوں کے متعلق سُنا کرتی تھی اور کبھی کبھی کسی سہیلی کے بھائی کو دیکھتی بھی تھی، اُن کے ساتھ چلتی پھرتی بھی تھی، مگر چند لمحوں کے لئے، کیونکہ مجھے لینے کے لئے ہماری گھوڑا گاڑی آجاتی تھی۔ ناولوں میں بھائیوں کا ذکر بھی میں نے پڑھ رکھا تھا۔ مگر مجھے بھائی کی خواہش، بھائی کی حاجت کبھی نہ ہوئی تھی۔ لیکن تمہیں میں نے شدّت سے بھائی محسوس کیا مگر یہ احساس زیادہ دیر قائم نہ رہا اور یہ سب الگ الگ احساس ایک اور احساس میں ضم ہو گئے، ڈھل گئے جو اِن احساسات سے وسیع، گہرا اور ہمہ گیر تھا۔ مَیں نے بارہا چاہا کہ اِک گھر ہو جس میں برجیس ہو، بچّے ہوں، تم ہو، میں ہوں اور سب گھُل مِل کر رہیں۔ برجیس کے لئے میرے جذبات ہمیشہ گہرے رہے ہیں، اگرچہ اُن کی نوعیت بدلتی رہی ہے۔ مَیں نے اُسے بہت چاہا ہے، کبھی کبھی مَیں نے اپنے خدا سے دُعا کی ہے کہ وہ مجھے مَرد بنا دے اور میں اُس کو مرد کی حیثیت سے چاہوں اور اُس کی دوست بن جاؤں اور تمہاری بھی۔ وہ میرے لئے ماں ہے، بہن ہے، دوست ہے، مُرشد ہے، مربّی ہے مجھے پتہ بھی نہیں چلتا اور وہ میرے پُرانے زخموں پر مرہم رکھ دیتی ہے اور زخم مندمل ہو جاتے ہیں اور میں بھول جاتی ہوں کہ کہاں کہاں زخم تھے۔

پہلے مَیں محسوس کرتی تھی کہ میں یسوع مسیح کی بیاہتا ہوں اور اب محسوس کرنے لگی ہوں کہ تمہاری بیاہتا ہوں۔ مجھے باوجود کوشش کے اس میں کوئی زوال نظر نہیں آیا، محسوس نہیں ہوا۔ مَیں نے اکثر سوچا ہے کہ میں نے یسوع مسیح

سے دَغا کی ہے، غداری کی ہے، مَیں نے یہودا الحرُوطی کی طرح یسوع کو چند سالوں، چند ماہ، چند دنوں یا لمحوں کی خوشیوں کے عوض بیچ دیا ہے۔ مگر میں اِس تصوّر کو اپنے اندر کبھی قبول نہیں کر سکی۔ مَیں نے بار بار شدّت سے محسوس کیا ہے کہ مَیں نے یسوع مسیح کو صلیب سے اُتار لیا جبکہ ابھی اس میں سانس تھا اور مَیں نے اُس کے زخموں پر مرہم لگا دیا ہے اور اُس کو رو بصحت ہونے کے لئے کسی صحت افزا مقام پر بھیج دیا جہاں وہ صحت یاب ہو گیا اور اپنے مشن کی اگلی منزل کی طرف روانہ ہو گیا ہے اور میرے لئے اظہارِ تشکر کا پیغام بھیجا ہے۔ مجھے یہ خیال آتا ہے کہ مَیں بے اَدبی کی مرتکب ہو رہی ہوں مگر میری روح، میرا قلب نہیں مانتا۔

میرے اندر اِک نئے یسوع مسیح نے جنم لیا ہے جو عہد نامہ جدید کے یسوع سے مختلف اور بہت پہلو دار اور تہہ دار ہے، طبق اندر طبق۔ جو حلیم بھی ہے حکیم بھی، باعظمت اور باجبروت، قلب آفرین، انتہائی شفیق اور ہمدرد، جس کی گفتار میں، کردار میں جمال ہے اور جلال بھی، جو دِلوں کو گرماتا ہے اور عمل پر اُبھارتا ہے، ایسا عمل جو ظلم و ستم ختم کر دے؛ تکریمِ آدم کو عام کر دے؛ ارض کو خوف سے، حُزن سے پاک کر دے؛ عورت کو مَرد کا رفیق اور دوست بنا دے؛ انسان اور دوسرے جانداروں کے درمیان جنگ کو ختم کر دے۔

میرا ذہن کہتا ہے کہ یسوع مسیح کو اپناؤ یا نادر علی خاں کو، دونوں کو تم اپنا نہیں سکتیں، دونوں میں کوئی ربط و رشتہ ممکن نہیں ہے۔ دِل کہتا ہے یسوع مسیح اور نادر علی خاں میں کوئی مخاصمت نہیں ہے؛ دونوں کا الگ الگ مقام ہے، دونوں کا الگ الگ جہاں ہے۔

تم بتاؤ میں کیا کروں ؟ میں کسی ایک کو اپنے دل و روح سے رخصت نہیں کر سکتی !

' دونوں ہی صحیح کہتے ہیں یسوع مسیح سے متعلق تمہارا تصور عہد نامہ جدید پر مبنی ہے۔ حیاتِ مسیح کے اِس تصور کے مطابق انسانی زندگی، خدا اور کائنات کا جو تصور ذہن میں آتا ہے وہ اس قدر خلافِ عقل ہے کہ اس پر عمل کرنا محال ہی نہیں ناممکن ہے۔ اِسی لئے کسی عیسائی نے پوری یا آدھی یا چوتھائی زندگی اس کے مطابق نہیں گزاری، حتیٰ کہ حواریوں نے بھی نہیں: ایک نے ان سے غداری کی اور دوسرے نے اُن سے کسی قسم کے تعلق سے تین بار لوگوں کے رُوبرو انکار کیا (یسوع مسیح کی پیش گوئی کے مطابق ہی سہی) 'بقیہ حوارین بھاگ گئے۔ خود سینٹ پال نے اِن حوارین کو قابلِ اعتنا یا پیروی کے قابل نہ جانا۔

خود عیسائی اور مغربی محققین کی کتابوں سے ظاہر ہے کہ عہد نامہ جدید کی چاروں کتابوں میں اتنا حک و اضافہ کیا گیا ہے کہ وہ اصل سے یکسر مختلف ہو گئی ہیں اور یہ کتابیں صرف یسوع مسیح کی سوانح قرار دی جا سکتی ہیں، خداوند خدا کی وحی اور پیغام قرار نہیں پا سکتیں۔ علاوہ ازیں یہ کتابیں یسوع مسیح کی صحیح سوانح بھی قرار نہیں دی جا سکتیں کیونکہ یسوع مسیح کو خداوند خدا نے جو مشن سپرد کیا تھا وہ نہ صرف یہودی قوم کے ہر فرد کی تشکیلِ نو بلکہ پورے یہودی معاشرے کی تشکیلِ نو چاہتا تھا، جس میں کوئی شخص اپنی کمائی میں سے اپنی حاجتوں سے زائد نہ رکھتا اور بقیہ کمائی دوسروں کے لئے وقف کر دیتا اور پورے معاشرے پر خداوند خدا کا قانون نافذ ہوتا۔ لہذا یہ پورا معاشرہ یہودی احبار اور رہبان کے اقتدار اور رُومی حکومت سے براہِ راست

متصادم تھا۔ لہٰذا دونوں نے اِس حریف کو مٹانے کا فیصلہ کرلیا۔ چونکہ یہ کُتب رومی دورِ سلطنت میں مرتب ہوئیں لہٰذا اُن کے مصنّفین نے رومیوں کو اِس ملی بھگت سے بے تعلّق اور ماوراء دکھایا۔

جب تک یسوع مسیح کا تصوّر اِن سوانح کے حوالے مرتّب ہوتا رہے گا تو یہ تصوّر نادر علی خاں کے تصوّرِ کائنات و حیات کے خلاف جائے گا اور اُن میں تصادم ناگزیر ہے لیکن اگر یسوع مسیح کا وہ تصوّر اپنا لیا جائے جو مغربی محقّقین کی تحقیقات کے نتیجے میں مرتّب ہوتا ہے تو وہ تصوّر خداوندِ خدا کے نبی اور رسول کا ہے جس پر اُس نے اپنی وحی نازل کی اور جس نے اس وحی کی اشاعت اور تبلیغ کی اور اس یسوع مسیح نے یہودی قوم میں اِک معاشرتی، معاشی، سیاسی، اخلاقی انقلاب اتنے مربوط اور ضابط طریقے سے، اتنے زور سے برپا کیا کہ یہودیوں کے احبار اور رہبان کے لئے صرف دو راستے ہی رہ گئے تھے: یسوع مسیح کی تعلیم کو قبول کر لیتے اور اپنے اقتدار اور دولت اور حشمت سے دستبردار ہوجاتے یا یسوع مسیح کو رومی اقتدار کی مدد سے ختم کروا دیتے۔ لہٰذا انہوں نے یسوع مسیح کو اپنی مذہبی عدالت سے موت کی سزا دلوائی اور رومی گورنر سے اُس کی تصدیق کروالی۔

اِس معاملے میں قرآن کے حوالے سے اتنا اضافہ کرنا چاہوں گا کہ یہودی اور رومی گٹھ جوڑ یسوع مسیح کو صلیب دینے میں کامیاب نہیں ہوا اور اللہ نے یسوع مسیح کو اِس دُنیا ہی میں بہت بلند مرتبہ عطا فرما دیا۔ اِس کے ساتھ اس بات کی بھی تصدیق کی کہ اُن کے حواریوں نے اُن کی تعلیم کی تبلیغ کے لئے جان کی بازی لگا دینے کا یسوع مسیح کے ساتھ عہد کیا اور اس عہد کو نبھایا۔

لہٰذا اُس یسوع مسیح کو اپنا دُ جو تاریخی اور عصری تحقیقات نے عیاں کیا ہے

اور جس کی تصدیق قرآن کرتا ہے تو پھر یسوع مسیح کی طرح معاشرے اور افراد کی تشکیلِ نو خداوندِ خدا کی ہدایت کے مطابق کرنا لازم آئے گی۔ اِس یسوع مسیح اور قرآن کی تعلیمات میں کوئی تضاد نہیں اور یہی تعلیم اپنی مکمل اور آخری صورت میں قرآن میں محفوظ ہے۔ اِس لئے اس یسوع مسیح میں اور نادر علی خان میں کوئی اختلاف اور تصادم نہیں ہے اور دونوں کو قلب و ذہن اور تخیّل میں ساتھ ساتھ آباد کیا جا سکتا ہے۔ دونوں تمہاری شخصیت کی مختلف تہوں کو سیراب کریں گے۔

چونکہ میں قرآن پر ایمان رکھتا ہوں اس لئے محمد رسول اللہ اور اُن سے پہلے تمام نبیوں اور رسولوں کو قبول کرنا میرے ایمان کا لازمی حصّہ ہے۔ لٰہذا یسوع مسیح میرے لئے نہایت ہی محترم و مکرّم ہستی ہیں کہ اللہ کے نبی اور رسول تھے اور اُن پر اللہ کی ہدایت کی کتاب انجیل نازل ہوئی تھی اور اُن کی والدہ مریم کو اللہ نے اپنی آیت (نشانی) قرار دیتے ہوئے تمام عورتوں میں سرفراز کیا۔

اب یہ فیصلہ کرنا تمہارا کام ہے کہ تم کس یسوع مسیح کو قبول کرتی ہو اور کس کی تعلیم پر عمل پیرا ہوتی ہو۔ اُس کے مطابق تمہارے اعمال مرتّب ہوں گے اور ان کا اثر تمہارے قلب اور ذہن اور تخیّل پر ہوگا۔ زندگی ناممکن ہو جائے یا اُس کے لئے کشادہ اور فلاح اور اصلح کی راہیں کھُلیں۔

میں دونوں صورتوں میں تمہارا ساتھ دوں گا مگر دوستی میں دیانت اسی صورت پیدا ہو سکے گی جب تم معاشرے کی تشکیلِ نو اور انسان کی صورت گری کے لئے خداوندِ خدا کی ہدایت کے مطابق کوشاں ہو جانے کا فیصلہ کرتی ہو۔ اور اس دوستی میں برجیس اور ہمارے بچّے برابر کے شریک ہوں گے۔

ابھی رات کچھ باقی ہے لٰہذا ہم دونوں کو سو جانا چاہیئے تاکہ صبح رشیل اور برجیس کو ہسپتال سے فارغ کر کے ہم دونوں مسز لوگار کی تیمار داری اور

خبرداری کر سکیں۔

جب مسز لوگار ہسپتال سے فارغ کر دی گئیں اور اپنے گھر آگئیں تو پھر اُن کے خاندان اور رشیل کے خاندان اور ہمارے خاندان کے درمیان قرب کے رشتے اور بڑھے۔ اُن کی تیمارداری کے دوران رشیل کے والد سارا سارا دن وہیں رہتے اور بعد ازاں مسز لوگار کے گھر تا آنکہ وہ صحت یاب ہو گئیں۔ رشیل کے والد اور رشیل کبھی اکٹھے، کبھی الگ الگ مسز لوگار کے پاس کئی کئی گھنٹے گزارتے رہے اور ہم بھی اُن کی موجودگی میں پہنچ جاتے تو مسز لوگار کہتیں کہ آپ لوگ کھل کر باتیں کریں اور میں صرف سنوں گی کہ میں عالم نہیں ہوں۔ اِس طرح بہت دِنوں بھرپور محفلیں رہیں۔ وہ اکثر کہتیں کہ اگر اُس دن برجیس نہ ہوتی تو وہ درد سے مر گئی ہوتیں اور سلویا ایک بار پھر یتیم ہو گئی ہوتی۔

کچھ نوجوان مرد اور عورت ڈاکٹروں نے ہمیں کلینک اور ہسپتال کے لئے اپنی خدمات بلا معاوضہ ہر روز چند گھنٹوں کے لئے پیش کیں اور اِک گمنام شخص نے ہمیں ہمارے کلینک اور ہسپتال کے لئے ایک چھ منزلہ عمارت کلینک کے قریب ہی خرید کر نذر کر دی۔ اِس طرح ہم نئی عمارت میں منتقل ہو گئے اور اوقات اور فرائض کی تقسیم اِس طرح ترتیب پائی کہ ہر ایک کو دن میں چھ گھنٹے کلینک اور ہسپتال سے فرصت کے مل جاتے جس کے دوران ڈاکٹر اپنی آمدن کے لئے کوشاں ہو جاتے اور ہم ایک دوسرے کے یہاں محفلیں جماتے، اکٹھے سیر کرتے، کبھی کبھار پیرس کے مضافات میں نکل جاتے۔

۶

"ایک دن میں صبح اٹھ کر باہر جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا کہ برجیس نے

میرے کمرے میں آکر کہا :۔

'آج تم گھر پر ہی رہو گے۔ میں نے ہسپتال میں اطلاع کر دی ہے۔ بچے بھی آج اسکول نہیں جائیں گے۔ آج ربیع الاوّل کی پہلی ہے اور مَیں چاہتی ہوں کہ بعض معاملات میں فیصلے ہو جائیں تو میلاد النبیؐ کے دن اُن فیصلوں پر عمل ہو جائے!'

'کیا بات ہے؟'

'آج ہم بچّوں کے ساتھ پکنک منائیں گے اور وہاں پورا معاملہ پیش کروں گی کیونکہ یہ معاملہ نہ صرف ہم دونوں سے متعلق ہے بلکہ بچّوں کی زندگی پر بھی اثر انداز ہے اور ہوگا!'

لہٰذا ہم دونوں اپنی موٹر کار میں درسائی چلے گئے۔ بچّوں کو محلات کی سیر کرائی، پکنک منائی۔ دوپہر کا کھانا کھایا، گھومے پھرے، سہ پہر کی چائے کے وقت پرجبیں نے سب کے رُوبرُو معاملہ پیش کیا۔

'بچّو! میں تم سے ایک نہایت اہم معاملے میں مشورہ کرنا چاہتی ہوں۔ اس معاملے میں تمہارا مشورہ جو بھی ہوگا وہ مجھے اور تمہارے والد کو قبول ہوگا۔ ہم نہیں چاہتے کہ کوئی فیصلہ تم پر مسلّط کیا جائے کیونکہ یہ میرے خاندان کی روایت نہیں ہے۔ ہم نے ہمیشہ ہر معاملہ اکٹھے بیٹھ کر، سر جوڑ کر، غور کرنے کے بعد، طے کیا ہے.... اب بھی ایسا ہی ہوگا۔

آپ کی سلویا خالہ آپ سب کو بہت عزیز ہیں۔ آپ کو اکثر اُن سے گلہ رہتا ہے کہ وہ آپ کے گھر ایک آدھ دن سے زیادہ کیوں قیام نہیں کرتیں اُن کو آپ کے ابّو سے بہت ہی پیار ہے۔ آپ کے ابّو بھی اُن کو بہت پسند کرتے ہیں اور پیار کرتے ہیں۔ مَیں بھی اُن سے بہت محبّت کرتی ہوں۔ وہ میری

بہن ہے، بیٹی ہے اور دوست ہے۔ کیا آپ چاہیں گے کہ وہ آپ کی دوسری امّی بن جائیں اور آپ کے ابّو سے اُن کی شادی ہو جائے اور وہ آپ کے ساتھ رہیں، اور ان کی نانی آپ کی پرنانی بن جائیں۔ اُن سے بھی آپ سب کو بہت پیار ہے اور وہ بھی آپ سب سے بہت محبّت کرتی ہیں۔ وہ بھی آپ کے ابّو سے محبّت کرتی ہیں۔ مجھ سے وہ نہ صرف محبّت کرتی ہیں بلکہ کئی بار تنہائی میں، اور رشیل اور سلویا کے رُو برُو بھی، مجھ سے کہہ چکی ہیں کہ کاش میں نے اُن کی کوکھ سے جنم لیا ہوتا اور اُن کی بیٹی ہوتی۔ اُن کی محبّت بہت گہری اور پُرخلوص ہے۔'

'امّی! یہی بات میں آپ سے کئی دنوں سے کہنا چاہ رہا تھا مگر مجھے کوئی موقع نہ مل رہا تھا۔ آپ نے میری مشکل آسان کردی ہے۔ مجھے پورا پورا یقین ہے کہ خالہ ہماری دوسری امّی بن گئیں تو وہ روایتی دوسری امّی سے بہت مختلف اور واقعی خالہ اور ماں ہوں گی۔ پنجابی میں ماسی ماں ایسی ہی کی شکل ہے۔

میں اِس معاملے میں بتول اور شرجیل سے بھی کئی بار بات کر چکا ہوں۔ ہم تینوں چاہتے ہیں کہ خالہ ہمارے یہاں آجائیں، ہمیشہ کے لئے۔ ابّو اور اُن کی شادی ہو جائے تو ہمیں بہت ہی خوشی ہوگی۔ مگر شرط یہ ہے کہ وہ باقاعدہ دُلہن بن کر آئیں اور شادی کی وہ سب پنجابی رسمیں اَدا کی جائیں جو شادی بیاہ میں اُدا کی جاتی ہیں، سوائے اُن رسموں کے جو خلافِ قرآن ہوں اور خالہ ہم تینوں سے اجازت طلب کریں کہ اُن کو ابّو کے ساتھ نکاح کرنے کی اجازت دے دی جائے۔ آپ دونوں نے تو اِس کا فیصلہ کر ہی لیا ہے۔'

'نہیں۔ تمہاری امّی نے اِس معاملے میں مجھ سے کوئی بات نہیں کی ہے

اور نہ ہی میں نے اُن سے۔ آپ لوگوں نے ہم سے مشورہ کئے بغیر یہ فیصلہ کس طرح کر لیا ہے۔؟'

'ابّو! آپ نے اور امّی نے ہمیں سکھایا ہے کہ ہر دم آنکھیں اور کان کھلے رکھیں اور حواس بیدار رکھیں کہ زندگی ہر دم نئے فیصلے کا تقاضہ کرتی ہے ہم نے الگ الگ یہ بات دیکھی ہے کہ رشیل خالہ آپ سے اس طرح محبت کرتی ہیں جس طرح میں بھیّا سے لیکن بلو یا خالہ امّی سے ایسی ہی محبت کرتی ہیں مگر آپ سے اِس طرح محبت کرتی ہیں جس طرح امّی آپ سے اور وہ اب ہم سے بھی اِس طرح پیار کرتی ہیں جس طرح امّی ہم سے۔ اِس لئے اِس مشاہدے کا ہم نے آپس میں ذکر کیا، اس پر اکھٹے بیٹھ کر کئی بار غور کیا ہے۔ اِس کا یہی حل ہے کہ خالہ اور آپ دونوں' بیاہ کر لیں لیکن چونکہ بلو یا خالہ ہماری دوسری امّی بننا چاہتی ہیں اس لئے اُن کو ہماری اجازت طلب کرنی چاہیئے۔ .... امّی ہمیں آپ کی طرف سے بہت تشویش تھی کہ آپ اِس رشتے کو قبول کریں گی کہ نہیں، حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ آپ اور خالہ میں بہت گہری محبت ہے.... ہم جاننا چاہیں گے کہ آپ نے یہ اچرج فیصلہ کیوں کیا ہے حالانکہ ابھی اِس معاملے نے اتنی شدّت اختیار نہیں کی کہ فیصلہ لازم آجائے۔

'بیٹی! میں اِس کے لئے قطعاً تیار نہ تھی کہ آپ مجھ سے یہ سوال کریں گی۔ بہر حال سوال اُٹھایا گیا ہے تو جواب دینا لازم ہے۔

تمہارے ابّو اور میں عام انسان ہیں۔ ہم دونوں نے اپنی تربیت خود کی ہے، مسلسل کوشش سے علم کی روشنی میں۔ مَیں نے اپنی زندگی کا ہر فیصلہ خود کیا ہے۔ تمہارے ابّو سے شادی کا فیصلہ بھی مَیں نے خود اپنی مرضی سے کیا تھا حالانکہ تمہارے نانا، ماموں، خالائیں، اِس شادی کے خلاف تھیں،

اگرچہ اِس معاملے میں وہ سب اپنی مرضی مجھ پر ٹھونسنا نہ چاہتے تھے، لیکن ساتھ ساتھ انہوں نے یہ بھی چھپایا نہیں کہ اگر میں اپنے فیصلے پر قائم رہتی ہوں تو مجھے اُن سب کی محبت سے ہاتھ دھونا ہوں گے۔ میں نے اِن حالات میں پانچ ہفتے مسلسل غور و خوض کیا۔ یہ مدّت میری زندگی میں انتہائی ابتلا کا زمانہ تھا۔ اِس سے اُس عورت نے جنم لیا جس نے تمہارے ابّو سے شادی کی اور آج تک میں اُس عورت کی پرورش اور صورت گری کرتی چلی آرہی ہوں اور مجھے کبھی اپنے فیصلے پر پشیمانی نہیں ہوئی اور مَیں آج تک خوش ہوں کہ میں نے تمہارے ابّو سے شادی کی۔

اِس سے پہلے بھی آپ کی ایک خالہ تھیں، پیٹیشیا۔ اُن کو آپ کے ابّو سے بہت گہری محبّت تھی مگر وہ آپ کے ابّو سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھیں کیونکہ وہ مجھ سے بھی اتنی ہی محبت کرتی تھیں اور وہ یہ سوچنا بھی گوارا نہیں کرتی تھیں کہ وہ میرے ساتھ آپ کے ابّو کی دوسری بیوی اور آپ کی دوسری امّی بن جائیں۔ اُن کی یہ حاجت نہیں تھی۔

لیکن سِلویا خالہ کا معاملہ دوسرا ہے۔ اُن کی پیدائش ہی کے ساتھ اُن کی والدہ کا انتقال ہوگیا اور وہ ابھی تین چار سال کی تھیں کہ ایک حادثے میں اُن کے والد کا بھی انتقال ہوگیا۔ لہٰذا انہوں نے ماں اور باپ کی محبّت کو نہ دیکھا اور نہ چکھا اور اُن کا بھائی بھی کوئی نہیں، بہن بھی کوئی نہیں، صرف ایک نانی ہے۔ لہٰذا آپ کے ابّو سے ان کی دوستی پہلے بھائی کی تلاش کی صورت ہوئی، پھر یہ تلاش باپ کی صورت ہوئی اور پھر اِک محبوب کی تلاش کی صورت اور پھر یہ تینوں صورتیں مل گئیں۔ آپ کے ابّو سِلویا کے بھائی ہیں، باپ ہیں اور محبوب۔ میں اُن کی ماں ہوں، بہن ہوں اور سہیلی۔ مجھے بھی وہ

بہن کی طرح، بیٹی کی طرح اور دوست کی طرح پیاری ہیں۔ مجھے اکثر یہ خیال آیا ہے کہ اگر میں مرد ہوتی تو اُسی سے شادی کرتی۔ میرے بہاتھ اس کے رشتے بہت گہرے اور تہہ دار ہیں۔

مَیں نے آپ کے ابّو سے بات اس لئے نہیں کی کہ مَیں اُن کے دل، ذہن اور تخیّل کو اِسی طرح جانتی ہوں جس طرح میں اپنے دل، ذہن اور تخیّل کو۔ جو مجھ پر بیتتی ہے وہ جانتے ہیں اور جو اُن پر بیتتی ہے میں جانتی ہوں اور جو ہم پر بیتتی ہے اس کو ہم قبول کرتے ہیں۔ چونکہ ہم جیسے لوگ نادر ہوتے ہیں اس لئے جو ہم کو پہچان لیتا ہے وہ نادر شناس ہوتا ہے اور نادر سے محبّت کرنا اُس کے وجود کی سب سے گہری ضرورت ہوتی ہے اور اُن کی شخصیّت یا ذات کی پرورش اور ترقی کے لئے لازم۔ ایسے نادر شناس بھی احترام کے قابل ہوتے ہیں۔ جب نادر اور نادر شناس میں محبّت ہو جائے تو دونوں کو ایک دوسرے کا زوج بن جانا لازم آتا ہے کہ وہ ایک بڑی وحدت بناتے ہیں اور وحدت بنانا ہی انسانوں کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

میں اور آپ کے ابّو عرصہ ہوا ایک وحدت میں ڈھل گئے تھے۔ اب سِلویا کے مِلاپ سے اِک بڑی وحدت بنانا ہماری ضرورت اور ہم تینوں کی ذوات کا تقاضہ ہے۔ اس لئے میں نے آپ کے ابّو سے بات نہیں کی تھی اور آپ سب کے رُوبرو کی ہے۔

آپ سب اس پر مزید سوچ لیں تاکہ میں سِلویا اور اُس کی نانی سے بات کرنا چاہوں گی، جلد تر کہ میں چاہتی ہوں کہ مِیلاد النّبی کے روز سِلویا ہمارے خاندان میں شامل ہو جائے۔

'امّی ہم اپنا فیصلہ بدل نہیں سکتے۔ آپ ہمارا فیصلہ قبول کر لیں۔'

'واہ رے، ننھّے میاں تم بھی خالہ کے شیدائی نکلے' میرے مُنہ سے نکلا۔
شرجیل شرمایا اور بولا :-
'میں بڑا ہوتا تو سلویا خالہ سے شادی میں ہی کرتا مگر میں بہت چھوٹا ہوں۔ میرے بڑا ہونے تک سلویا خالہ بوڑھی ہوجائیں گی اور انتظار کرتے کرتے تھک جائیں گی۔ اِس لئے آپ شادی کرلیں اُن سے لیکن ہم تینوں سے سلویا خالہ اجازت ضرور لیں'

عیدِ میلادالنبیؐ کے دن سلویا میری بیوی بن گئی اور ہم سب نے یونان اٹلی اور اسپین میں اِک طویل تعطیل منائی۔ ایسا ہنی مون شاید ہی کسی بیوی نے منایا ہو اور خوش رہی ہو، جس طرح سلویا اور برجیس خوش تھیں بعض دفعہ میں اُن کی آپس کی محبّت سے اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا، مگر اِک لمحے بھر کے لئے، جو لمحے کی حدود کبھی نہ پھلانگتا۔ اکثر میرا جی چاہتا کہ میں بیک وقت دو ہم شکل، ہم کردار، انسان بننے پر قادر ہوتا اور برجیس اور سلویا سے بیک وقت پیار کرسکتا اور اُن دونوں کو ایک دوسرے کا انتظار نہ کرنا پڑتا۔ اِس خیال پر میں اپنے اندر مُسکرایا کرتا کہ ایسا تو صرف اُسطورے میں ہوتا ہے اور وہ بھی کرشن اور رادھا کے اُسطورے میں اور میں اُسطوری انسان نہ تھا بلکہ اِک ارضی انسان تھا اور ارض پر اللہ کے قوانین کا اطلاق تھا، جہاں ایسا ہونا ناممکن تھا۔

چار سال بہت جلد بیت گئے۔ شاید ہی مسرت اور فرحت کبھی ارض پر جاودانی ہو پائے۔ یہ صرف اَلم و مصیبت اور آفت کا نصیب ہے کہ وہ ابدیت میں محیط محسوس ہوتے ہیں۔ جب تلک روحِ انسانی پر سایہ فگن رہتے ہیں۔ اِس عرصے میں سلویا اِک بیٹی کی ماں بنی اور بتول نے اُس کا

نام طاہرہ رکھ دیا اور اسی نام سے اُسے بُلانے لگی۔ سلویا کو جب اِس کا ترجمہ بتایا گیا تو اُس نے اِس نام کو قبول کر لیا۔ لیکن اِس نام کی معنویت کا احساس صرف برجیس اور مجھے ہی تھا اور ہم خاموش رہے۔ بچی کی پیدائش کے بعد سلویا کی بے پایاں خوشی اور خوشی میں کبھی کبھی اَلَم کا رنگ نمایاں ہو جاتا، اُڑتے لمحے کے لئے برجیس نے اور مَیں نے اِس کا الگ الگ مشاہدہ کیا اور کئی بار ایسا مشاہدہ کرنے کے بعد ہم دونوں نے ایک اور فیصلہ کیا کہ آپس میں اِس معاملے کے بارے میں بات کریں۔ ایک دن بچے طاہرہ کے ساتھ کھیل رہے تھے اور سلویا ان کے ساتھ مصروف تھی کہ ہم دونوں نے ایک ساتھ اُس کے چہرے پر لمحے بھر کے لئے اَلَم کی پرچھائیں دیکھی اور ہم دونوں نے نظروں ہی نظروں میں تبادلۂ خیال کیا۔ اِس کے بعد ہم دونوں نے فیصلہ کیا کہ اِس کا سبب ڈھونڈیں گے۔ شاید سلویا کو اس کا احساس ہو گیا تھا کہ ہم اُس کو کچھ زیادہ ہی توجہ دے رہے ہیں۔ لہٰذا مہینوں یہ سایہ اُس کے چہرے سے، آنکھوں سے، اُس کے جسم سے دُور رہا؛ یا شاید اُس کے دل کی گہرائیوں میں چھُپ گیا۔

۷

"ایک دن برجیس نے تجویز کیا کہ اس سال حج کو چلیں۔ طے ہوا کہ بچے سلویا اور اُس کی نانی کے پاس رہیں۔ ہمارے ارادے کی خبر جب رشیل کو ہوئی تو اُس نے اپنے والد سے اس کا ذکر کیا اور اصرار کیا کہ اُس کو ہمارے ساتھ جانے کی اجازت دی جائے تاکہ وہ یروشلم میں اپنی ماں کے رشتہ داروں سے مِل آئے اور فلسطین کی سیر کر آئے۔ اُس کے والد نے برجیس سے اور مجھ

سے بات کی۔ طے ہوا کہ وہ ہمارے ساتھ جائے گی۔ جب بلویا نے یہ سُنا تو وہ بھی فلسطین جانے پر تُل گئی۔ اُس کی نانی نے حامی بھر لی کہ امجد، بتول اور شرجیل کی موجودگی میں وہ اکیلی محسوس نہ کریں گی اور وہ اُن کے ساتھ مل کر طاہرہ کی نگہداشت کر لیں گی اور طاہرہ ماں باپ کی غیر موجودگی کو محسوس نہیں کرے گی کہ امجد اور بتول دن رات کے بیشتر اوقات میں اُس کی نگہداشت کرتے تھے اور جذباتی سطح پر وہی اُس کے باپ اور ماں تھے اور وہ انہی کے ہاتھ سے کھاتی پیتی تھی اور اُنہی کے ساتھ اور اُن کی غیر حاضری میں چچا میاں کے بچّوں کے ساتھ کھیلتی تھی۔ بہر حال ہم تینوں نے طاہرہ کے طرزِ عمل کا غور سے مطالعہ کیا اور اکثر گھر سے غیر حاضر رہنے لگے احساس یہی ہوا کہ وہ اپنے بہن بھائیوں اور پرنانی اُماں کی موجودگی میں ہماری غیر حاضری کو محسوس نہیں کرے گی۔ وہ تین سال کی ہو چکی تھی۔ لہٰذا ہم نے اُس سے بات کی کہ ہم کچھ عرصے کے لئے دُور جا رہے ہیں اور اس کے بھائی بہن اور پرنانی (جس کو وہ نانی ہی کہتی تھی) اماں اور چچا میاں، چچی اور اُن کے بچے اُس کے ساتھ رہیں گے، کبھی اپنے گھر میں اور کبھی نانی اماں کے ساتھ۔ دو ہفتے میں بچّی نے اپنے آپ کو اِس خیال کے ساتھ ہم آہنگ کر لیا اور ہم سے کہا کہ آپ جاتے کیوں نہیں۔

لارڈ بورن متھ نے فلسطین کے برطانوی عہدے داروں کے لئے ہمیں خطوط بھجوائے اور اُن کو بھی ہماری آمد سے مطلع کر دیا۔ اُن کا چھوٹا بھائی برطانوی انتظامیہ میں بہت بڑا عہدے دار تھا۔ لہٰذا ہم اطمینان سے یروشلم پہنچے۔ رشیل کے رشتہ داروں کو ڈھونڈا۔ اُس کے اپنے رشتہ دار تو حیفہ میں آباد ہو گئے تھے مگر اُن کے کچھ رشتہ دار یوروشلم میں ہی تھے۔ ان کو حیفہ

میں اطلاع کی۔ وہ بھاگے چلے آئے۔ ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اُن کے اور لارڈ بورن متھ کے بھائی کے درمیان طے ہوا کہ ایک ماہ رشیل اور سِلویا دو قسطوں میں رشیل کے رشتہ داروں کے پاس اور ایک ماہ دو قسطوں میں یوروشلم میں لارڈ بورن متھ کے یہاں قیام کریں گی ہم سب نے یوروشلم اور دوسرے مقامات کی زیارتیں کیں۔ اِس کے بعد ہم دونوں جدّہ چلے گئے، سفیر برطانیہ لارڈ بورن متھ کے تعارفی خط کے حوالے سے ملاقات کی۔ اُن سے طے کیا کہ وہ یوروشلم سے ریڈیو ٹرانسمیٹر کے ذریعے سِلویا اور رشیل کی خبر حاصل کر کے مدینے جانے والے قافلہ سالاروں کے ذریعے ہمیں آگاہ کرتے رہیں گے۔

مکّہ معظّمہ میں عمرہ کیا اور مدینہ منوّرہ روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچے تو ہمارے میزبان اور مالک مکان منزل پر ہمارے منتظر تھے اور صبح ابھی دُور تھی۔ گھر پہنچے وہاں سامان رکھا، نہائے اور اپنے مالک مکان کے ساتھ تہجّد کی نماز کے لئے مسجدِ نبوی پہنچے۔ نمازِ فجر کے بعد نمازِ ظہر تک وہیں تلاوتِ قرآن کرتے رہے۔ نمازِ ظہر کے بعد گھر آئے، دوپہر کا کھانا کھایا۔ کچھ دیر آرام کیا اور پھر عصر کی نماز کے لئے مسجدِ نبوی واپس پہنچے اور نمازِ عشاء پڑھ کر گھر لوٹے۔ کھانا کھایا اور جلد ہی سو گئے۔ نمازِ تہجّد کے لئے واپس پہنچے اور نمازِ ظہر پڑھ کر گھر لوٹے، کھانا کھایا، آرام کیا اور واپس نمازِ عصر کے لئے لوٹے اور نمازِ عشاء پڑھ کر واپس گھر آئے۔ ہر روز یہی معمول رہا۔ کوئی سات دن اور مسجدِ نبوی میں نمازِ ظہر کی دُعا کے بعد شور ہوا کہ فضل محمد الهندی کی بیٹی کو دَورہ پڑا ہے۔ برجیس فوراً وہاں پہنچی، اپنا تعارف کرایا، لڑکی کا معائنہ کیا، اور اپنے شانے سے لٹکے چرمی تھیلے سے دَوا نکال کر پلائی اور جب تک اُس کو ہوش نہ آیا وہ ساتھ رہی۔ جب وہ وہاں سے چلے تو اُنھوں نے اصرار

کیا کہ برجیس اور میں ساتھ چلیں کہ برجیس مریضہ پر نظر رکھے رہے گی اور ہم سب ساتھ کھانا کھائیں گے اور پھر نمازِ عصر کے لئے لوٹ آئیں گے۔ جب ہم واپس آنے لگے تو مریضہ کہ اب صحت یاب تھی ہمارے ساتھ لوٹ آنے پر مصر ہوئی۔ برجیس نے اُس کی والدہ کو تسلّی دی کہ اُس کو اَب دورہ نہ پڑے گا اور اس کا جانا باعثِ تشویش نہ ہو گا۔ مریضہ کو بھی وہی بیماری تھی جس کے علاج میں برجیس کو مہارت حاصل تھی اور پیرس میں جس کے سبب اُس کی شہرت ہوئی تھی۔ اُس کے بعد ہم نے اجنبی میزبان کے ساتھ اس کے اصرار پر یہ لائحہ عمل تیار کیا کہ ہم ہر روز ساتھ رہیں گے اور اُن کے یہاں ہی اُٹھ آئیں گے کہ دو افراد کے لئے پورا گھر رکھنے کی کوئی تُک نہ تھی۔ ہماری میزبان اور اُن کے میاں کے خاندان پنجاب ہی کے رہنے والے تھے اور ہمارے شہر کے قریب ہی کسی قصبے میں رہا کرتے تھے۔ اِس سے ہم دونوں خاندانوں میں قُرب بڑھا۔ اُنھوں نے بتایا کہ اُن کے میاں جیفہ میں مقیم ہیں اور اُن کا وسیع کاروبار افریقہ سے انگلستان تک پھیلا ہوا ہے۔

ایک رات تہجّد کے لئے مسجدِ نبوی پہنچے اور نماز اَدا کرنے کے بعد عبادت میں مصروف ہو گئے۔ فجر کی اذان ہوئی تو ہم نے محسوس کیا کہ کچھ لوگ مسجد میں داخل ہوئے ہیں۔ سوچا کہ کوئی قافلہ ابھی ابھی مدینہ منورہ پہنچا ہو گا۔ جب نمازِ فجر پڑھ کر تلاوتِ قرآن کے لئے اپنے مقررہ مقام پر جا بیٹھے تو ہم نے محسوس کیا کہ کچھ لوگ ہمارے پیچھے آکر بیٹھ گئے ہیں اور تلاوتِ قرآن میں مصروف ہو گئے ہیں۔ جب ہم ظہر کی نماز کے بعد گھر پہنچے تو ملازموں نے بتایا، سربراہِ خاندان مدینہ پہنچ گئے ہیں، نہا کر مسجدِ نبوی گئے ہیں؛ اُن کے ساتھ ایک محترمہ بھی آئی ہیں؛ وہ اُوپر کی منزل میں اُس کمرے میں مقیم ہیں جس کی کھڑکیاں

مسجدِ نبوی کی طرف کھلتی ہیں؛ اجنبی مہمان جب سے کمرے میں داخل ہوئی ہیں. کھڑکی کے رُو برو بیٹھی مسجدِ نبوی کے گنبد کو تکے جارہی ہیں اور اُن کو کسی اور بات کا ہوش نہیں ہے؛ الہندی صاحب مہمان عورت کے خاوند کو ڈھونڈنے جائیں گے اور اُن کو لے کر ہی واپس آئیں گے' اور کھانے پر اُن کا انتظار کیا جائے گا کہ سب اکھٹے ہی کھانا کھائیں گے۔

ابھی ملازموں کی کارگذاری کی رُوداد ختم نہ ہوئی تھی کہ الہندی صاحب تشریف لے آئے اور آتے ہی بولے :بچہ بغل میں ڈھونڈورہ شہر میں۔ میں آپ کو ڈھونڈتا پھرا اور آخر معلوم ہوا کہ آپ تو ہمارے ہی یہاں مقیم ہیں۔ آپ کو میں نے فاطمہ اور اُس کی ماں کے پاس بیٹھا دیکھا تھا مگر اس وقت مجھے معلوم نہ تھا کہ مجھے آپ کی تلاش ہے۔ فاطمہ اور اس کی ماں تلاوت میں اِس قدر ڈوبی تھیں کہ مجھے اُن کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی جرأت ہی نہ ہوئی۔

بھئی بیگم مہمان لے کر آیا ہوں' تم اِن سے ملی نہیں ؟ کہاں ہیں! آپ کے پُرانے مہمان کی بیگم ہیں اور دونوں بیگموں میں بہت محبّت ہے؛ بہنوں کی طرح' دوستوں کی طرح ؛

ہم بھی ابھی ابھی پہنچے ہیں۔ ملازموں نے آپ کے آنے کی اطلاع دی۔ ابھی اُن کی باتیں ختم نہیں ہوئی تھیں کہ آپ آگئے۔ اکھٹے چلتے ہیں اُوپر اپنے مہمان سے ملنے۔

ہماری میزبان نے ملازموں کو کھانا لگانے کے لئے کہا اور ہم اکھٹے اوپر پہنچے۔ جب ہم دروازے پر پہنچے تو سلو یا کھڑکی کی چوکھٹ پر ٹھوڑی رکھے، دور نظر جمائے اپنے ماحول سے بے خبر بیٹھی تھی۔ ہم چپکے سے اندر

داخل ہوئے اور فرش پر بچھے ہوئے قالین پر بچھی ہوئی چادر پر فضل محمد الہدی کی تجویز پر اِس طرح کہ صرف اُن کا مُنہ کھڑکی کی طرف تھا، برجیس اور مَیں کھڑکی کی طرف پُشت کئے بیٹھے تھے اور برجیس کے ساتھ ہماری میزبان اور اُن کی بیٹی فاطمہ اس طرح کہ صرف اُن کے چہرے کا ایک رُخ کھڑکی کی طرف تھا۔

کچھ دیر ہم خاموش بیٹھے رہے۔ اتنے میں ہم نے سُنا:۔

'O God of Muhammad! Help me! Guide me! I know not what to do! I have travelled toward you!

ہم سب سکتے میں آ گئے۔ صاحبِ خانہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور بولے:۔

My daughter! You obeyed the call and are here. Now the God of Muhammad and of all mankind will guide you, what to do. You must wait and pray.

I have found your husband. He is here'

ہم دونوں اُٹھے اور اُس کے رُو برو ہوئے۔ سلویا برجیس کی طرف بڑھی اور اُس سے بغلگیر ہوئی اور اپنا دایاں ہاتھ میری طرف بڑھا دیا جس کو میں اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ صاحبِ خانہ نے اپنی بیگم اور بیٹی کا تعارف کرایا۔ اور پھر ہم سب نچلی منزل پر آ گئے۔ کھانا لگ رہا رہا تھا۔ سب فرش پر بیٹھ کھانا کھانے لگے۔

اتنے میں عصر کی اذان ہوئی تو سلویا چونکی۔ اُس نے ہم سب کے چہروں کو دیکھا اور پڑھا کہ ہم سب جانے کو تیار ہو رہے تھے۔ وہ بولی:۔

'کیا میں آپ کے ساتھ نہیں جا سکتی ؟'

' آج آپ آرام کریں ، بلکہ ہو سکے تو سو جائیں ۔ ہو سکتا ہے اس عرصہ میں اللہ کوئی فیصلہ کر دے ۔ کسی قسم کا فکر نہ کریں ۔ یہ گھر آپ کا ہے ۔ بُلانے والے نے بُلایا ہے تو ضرور ہے کہ وہ بتائے کہ اُس نے آپ کو کیوں بُلایا ہے 'Be at peace. Allah is your Host here'

رستے میں صاحب خانہ نے بتایا :۔

' ایک دن میں اپنے مرشد کے پاس بیٹھا تھا ۔ وہ مجھے اِک مسئلہ سمجھا رہے تھے کہ یکایک چُپ ہو گئے ۔ گھڑے ہوئے ، محسوس ہوا کہ جیسے سُن رہے ہوں ۔ کچھ دیر کے بعد بولے :۔

" آؤ چلیں ۔"

مجھے لے کر وہ حیفہ کی یہودی آبادی میں نکل گئے ۔ ایک محلّے میں داخل ہوئے اور ایک مکان کے سامنے رُک گئے ۔ دروازہ کھُلا اور ایک باریش یہودی اندر سے نکلا اور اُن کو دیکھتے ہی اُس کا چہرہ کھِلا اور وہ پکارا :۔

' یا شیخ ! آپ ؟ یہاں ؟ زہے نصیب ۔ وہ میرے گھر آیا جس کے دَر پر ہر دم نیکیاں نازل ہوتی رہتی ہیں ۔ تشریف لائیے ؛'

ہم گھر کے اندر داخل ہو گئے اور ایک بڑے سے کمرے میں قالین کے اوپر کچھ نوجوان بیٹھے باتیں کر رہے تھے ۔ ہمیں دیکھ کر حیران ہوئے اور کھڑے ہو گئے ۔ میزبان نے تعارف کرایا ۔ اُن میں سے ایک اندر چلا گیا اور ہم سب بیٹھ گئے ۔ اتنے میں ملازمہ آئی اور میزبان کو مطلع کیا کہ اس کو اندر یاد کیا جا رہا ہے ۔ وہ اندر چلا گیا تو نوجوان کافی لے آیا ۔ اتنے میں میزبان بھی مسکراتا ہوا لوٹ آیا اور کہنے لگا :۔

"میرے اہلِ خانہ سب، آپ کو سلام کہتے ہیں۔۔۔"

"وعلیکم السّلام!"

"ہمارے یہاں کچھ ہفتوں سے فرانس سے مہمان آئے ہوئے ہیں۔ایک تو میری رشتہ دار ہے۔اُس کے ساتھ اُس کی ایک عیسائی سہیلی ہے۔اُن کی شادی ایک ہندی مسلمان سے ہوئی ہے۔وہ اُن کی دوسری بیگم ہیں۔اُن کے میاں اُن دونوں کو یہاں چھوڑ خود سعودی عرب حج کرنے گئے ہیں۔ابھی حج میں چند ہفتے باقی ہیں۔وہ اِس وقت مدینے میں ہیں۔حج سے فارغ ہو کر اِن کو لینے آئیں گے۔

میرے عیسائی مہمان نے خواب میں کسی کو پکارتے سُنا ہے؛ جیسے اُس کو بُلایا جا رہا ہو۔مُسلسل تین راتوں سے اُس کو خواب میں کوئی بُلاتا ہے۔آپ کے آنے کی اطلاع اندر ہوئی تو میری بیگم نے عرض کیا کہ آپ سے خواب کی تعبیر پوچھی جائے۔مَیں نے اُس کو ڈانٹا کہ آپ آج پہلی بار میرے یہاں تشریف لائے ہیں اور آپ سے مَیں کوئی فرمائش نہیں کروں گا۔اُس کا اِصرار ہے کہ شاید آپ کو اِسی لئے بھیجا ہے بھیجنے والے نے۔اِس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔"

"اپنے مہمان سے کہیں کہ خود آ کر خواب بیان کریں۔اگر اُن کو پردہ ہے تو مَیں اُن کے پاس چلا جاتا ہوں۔وہ پردے کے پیچھے سے خواب بیان کر دیں۔"

"وہ خود چلی آئیں گی۔وہ پیرس میں ایک ہسپتال کی سربراہ ہیں اور اُن کے مریض عورتیں اور مرد دونوں ہوتے ہیں۔"

ہمارے میزبان اندر گئے اور ایک محترمہ کو لے آئے اور میرے مُرشد

کے رُوبرو بٹھا دیا۔ باقی حاضرین اُٹھ کر اندر چلے گئے۔

"بیٹی مجھے اپنا خواب سُنائیں۔"

"میں نے دیکھا کہ اِک شہر ہے۔ شہر کے مکانوں سے بلند ایک گنبد ہے، سبز۔ اُس پر نور کی بارش ہو رہی ہے۔ اس کے اندر سے آواز آرہی ہے، آہستہ آہستہ اور مدھم، مگر واضح۔ اِس آواز میں حلم ہے بے نہایت اور پیار اور شفقت۔ یہ آواز کہتی ہے 'سلویا' پیرس سے تمہیں میں نے بلایا ہے اور تم جیفہ میں رُکی بیٹھی ہو۔ میں تمہارے انتظار میں ہوں۔ آؤ۔"

"جس نے آپ کو بُلایا ہے اُس نے مجھے بھیجا ہے۔ سیّدی فضل محمد الهندی مدینے میں آباد ہیں۔ اُن کی بیوی اور بیٹی وہیں ہیں۔ وہ دو دن میں مدینے کے لئے روانہ ہو رہے ہیں۔ اگر آپ فیصلہ کر لیتی ہیں کہ آپ نے مدینے جانا ہے تو جناب ہندی آپ کو ساتھ لے جائیں گے۔ مدینے تک پہنچنے کا انتظام میں کئے دیتا ہوں۔ آپ سوچ لیں اور مجھے مطلع کر دیں۔ آپ کے سفر کے نگراں اور ساتھی آپ کو یہاں سے لے لیں گے۔ اب آپ آرام کریں۔"

محترمہ اندر چلی گئیں تو میرے مُرشد نے اجازت طلب کی۔

"میں خوش تھا کہ آپ میرے یہاں آئے ہیں لیکن آپ تو اپنے نبی کے مہمان سے ملنے آئے تھے، پھر بھی میں ممنون ہوں کہ آپ آئے۔ کبھی مجھے ملنے کے لئے بھی آئیں۔ میں تو حاضر ہوتا ہی رہتا ہوں، ہوتا ہی رہوں گا۔"

"آپ کے مہمان خوش نصیب ہیں کہ اُن کو پیرس بُلاوا آگیا۔ میں ہر سال اجازت طلب کرتا ہوں اور مجھے اجازت نہیں ملتی۔ جیفہ ہی رہنے کا حکم ملتا ہے۔ جب محترمہ فیصلہ کر لیں تو مجھے اطلاع کر دیں۔ جناب ہندی اُن کو یہاں

سے لے لیں گے۔ اب اجازت دیں۔ بہت سے طالب علم منتظر ہیں۔ اللہ حافظ"

اگلے دن صبح اطلاع ملی کہ نبی کی مہمان نبی کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتی ہیں۔ لہٰذا اُن کو لے کر جدّہ پہنچا۔ سفیر برطانیہ کو اطلاع کی کہ آپ کی بیگم کو مدینے لئے جاتا ہوں۔ بہت کوشش کے باوجود نمازِ تہجد سے پہلے مدینے نہ پہنچ سکے۔ آپ کو تلاش کیا تو معلوم ہوا کہ جس کو ڈھونڈتے تھے وہ اپنے ہی گھر میں مہمان تھا۔

رات جب ہم نمازِ عشاء کے بعد گھر پہنچے تو معلوم ہوا کہ سلویا سوئی رہی اور ابھی ابھی اُٹھی ہے۔ نہا کر کپڑے بدلے ہیں۔ ہم کھانا کھا کر فارغ ہوئے تو اِک پیامبر آگیا، امامِ مسجدِ نبوی کا۔ صاحب خانہ اُس سے مل کر آئے تو خوش خبری سنائی کہ سلویا آدھی رات سے نمازِ تہجد تک رسول اللہ کے روضے کی جالی کے رُو برو حاضر رہ سکتی ہے۔ اِس وقت وہاں کوئی نہ ہوگا۔ لیکن تہجد سے پہلے اُس کو وہاں سے لوٹ آنا ہوگا۔ فیصلہ ہوا صاحب خانہ خود سلویا کو لے کر امام صاحب کے گھر اُن کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور خود ہی آکر اُس کو گھر چھوڑ جائیں گے۔

لہٰذا آدھی رات سے پہلے ہماری میزبان نے سلویا کو نہلایا، نیا جوڑا پہنایا اور اس پر اِک نیا جلباب اور نقاب۔ دونوں کو رخصت کیا۔ جب ہم نمازِ تہجد کے لئے مسجدِ نبوی روانہ ہوئے تو وہ دونوں واپس نہیں لوٹے تھے۔ مسجدِ نبوی پہنچے نمازِ تہجد ادا کی۔ نمازِ فجر کے بعد پتہ چلا کہ رات نمازِ تہجد تک سلویا روضۂ رسول اللہ کی جالی کے رُو برو کھڑی روتی رہی اور اپنی زبان میں پکارتی رہی۔ جب امام صاحب اس کو وہاں سے واپس لانے کے لئے پہنچے تو اُس کی آہ و زاری میں اتنی رقّت، اتنا خضوع اور خشوع تھا کہ،

بقول امام صاحب وہ لرز گئے اور گنتے رہے۔ کچھ دیر بعد انہوں نے محسوس کیا کہ اگر انہوں نے اس کو سہارا نہ دیا تو وہ گر پڑے گی۔ لہٰذا وہ اُسے سہارا دیئے واپس لائے اور اُس کو اپنی بیگم کے حوالے کیا۔ وہ اُس کو لے کر گھر گئیں جو مسجدِ نبوی کے پاس ہی تھا۔

جب ہم نمازِ ظہر کے بعد گھر پہنچے تو سلویا اپنے کمرے میں تھی۔ برجیس اوپر گئی تو اُس نے دیکھا کہ وہ کھڑکی کی چوکھٹ سے کمر لگائے کھڑی ہے اور گنبدِ خضرا کو تکے جاتی ہے اور اپنے آپ میں نہیں ہے۔ وہ اُلٹے پاؤں لوٹ آئی۔ اُس پر یہی کیفیت پانچ دن طاری رہی۔ آخر ایک رات جب ہم تہجد کی نماز کے لئے مسجدِ نبوی جانے کے لئے تیار ہو رہے تھے تو وہ آئی اور پکاری :-

"آج میں آپ کے ساتھ جاؤں گی۔ میں نے طے کر لیا ہے اللہ اور اُس کے نبی اور رسول، محمدؐ کے حضور اپنی اطاعت کا اقرار کروں"

ہم سب سکتے میں آگئے۔ پھر یکایک اِک بے پایاں مسرت و فرحت ہم پر نازل ہوئی۔ برجیس نے 'ہماری میزبان نے' اُن کی بیٹی فاطمہ نے اُس کو چُوم لیا۔ ہم نے اُس کی طرف دیکھا۔ وہ نہا کر اُجلے نئے کپڑے پہن کر آئی تھی۔ جلباب اور نقاب اُس کے دائیں بازو پر پڑے تھے۔ ہم اُس کو لے کر امام صاحب کے گھر پہنچے تو وہ گھر سے نکل رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر حیران ہوئے۔ مقصد بیان کیا تو اُن کے آنسو نکل آئے۔ اپنی بیگم کو بُلایا اور سلویا کو اُس کے سپرد کیا اور خود ہمارے ساتھ چلے آئے۔ ہمیں بتایا کہ نمازِ فجر سے پہلے اُس کے ایمان لانے کا اعلان کیا جائے گا۔ اس کے بعد نماز ہوگی۔

لہٰذا پہلے نمازِ تہجد ادا کی اُس کے بعد عبادت میں مشغول ہوئے۔ فجر کی اذان

ہوئی۔ اس سے پہلے نمازِ فجر نے کبھی اس طرح دل کو دہلایا نہ تھا۔ ایک ہیبت دل پر طاری ہوئی جیسے روزِ محشر ہو اور ہم سب وہاں اللہ کے رُو برو پیش ہونے والے ہو۔ تھوڑی دیر بعد اعلان ہوا کہ ایک فرانسیسی عیسائی عورت اسلام قبول کرنا چاہتی ہے، حاضرین گواہ رہیں۔ امام صاحب نے فضل محمّد الہندی کے ذریعے سِلویا کو کلمہ پڑھایا اور اُس کا نام عائشہ رکھا اور عائشہ سے اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کا اقرار لیا۔ اُس کے لئے دُعا کی۔ پھر نماز کے لئے تکبیر پڑھی گئی اور ہم سب عائشہ سمیت نماز کے لئے کھڑے ہوئے اور نماز ادا کی۔ اُس دن وہ بھی نمازِ ظہر تک ہمارے ساتھ تلاوتِ قرآن میں مصروف رہی کہ وہ اپنے ساتھ قرآن کا فرانسیسی ترجمہ لے آئی تھی۔

جب ہم نمازِ ظہر سے فارغ ہو کر امام صاحب کے گھر گئے کہ اُن کی عنایات کا شکریہ ادا کریں تو انہوں نے ہمیں اگلے دن دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا۔ ہم عائشہ کو لے کر گھر آئے تو گھر میں مہمان عورتوں کا ہجوم تھا۔ مردانے میں مرد مبارک باد دینے آئے تھے۔ سب تو مسلم کے لئے تحفے لے کر آئے تھے۔

عصر کی اذان ہوئی تو عائشہ بھی ساتھ مسجدِ نبوی گئی۔ امام صاحب کے پیچھے فرض پڑھے۔ اِس کے بعد وہ اپنا فرانسیسی ترجمہ قرآن پڑھتی رہی۔ عشار کی نماز پڑھ کر ہم گھر لوٹے۔ رات کے کھانے کے بعد برجیس نے اس کو عربی میں نماز سکھائی۔ اس کو میں نے اتنا خوش کبھی نہ دیکھا تھا۔ اُس کے چہرے پر اِک ملکوتی حُسن تھا۔ اُس کی آنکھوں میں بلوریں چراغ روشن تھے۔ اُس کے چہرے پر نظر ٹکتی نہ تھی، احترام سے جُھک جاتی تھی۔ وہ ارض پر نہ تھی۔ آسمان پر تھی۔ وہ سات دن ہمارے ساتھ مسجدِ نبوی میں نمازِ تہجد سے لے کر نمازِ ظہر تک، نمازِ عصر سے نمازِ عشار تک حاضر رہتی، نمازیں پڑھتی،

تلاوتِ قرآن کرتی۔ دوبار امام صاحب کی اجازت سے وہ نمازِ تہجّد سے پہلے رسول اللہ کے روضے کی جالی کے رُو برو دُعا مانگنے کے لئے حاضر رہی۔

پھر ہم مکّہ مکرمہ آئے۔ حج کیا۔ طواف کے وقت اُس پر عجب کیفیت طاری رہی۔ وہ خوش تھی، اپنی خوش بختی پر حیران تھی۔ ممنون اور شکر گزار تھی۔ احساسِ ممنونیت سے وہ فرشِ حرم پر بچھی جاتی تھی۔ جب کبھی اُس پر نظر پڑ جاتی تو محسوس ہوتا، اُس کو شادی مرگ ہونے والا ہے، کبھی لگتا کہ اُس کے انگ انگ سے عجز و اطاعت کا احساس پھوٹ رہا ہے؛ اُس کے پاؤں فرشِ حرم پر ٹکتے نہ تھے، وہ اُڑتی پھرتی تھی؛ اس کے بس میں ہوتا تو وہ جان جانِ آفرین کے سپرد کر دیتی اور سُرخرو ہو جاتی۔ مگر اُسے ابھی اِس ارض پر رہنا تھا، دُکھ جھیلنے تھے۔

جب ہم مناسکِ حج سے فارغ ہوئے تو فضل محمد الہندی کی بیگم نے اُس رات کھانے کے بعد اپنے میاں، اپنی بیٹی، برجیس اور عائشہ کی موجودگی میں مجھے مخاطب کر کے کہا :-

"جب بیٹے! تم ہمارے یہاں دوسری بار آئے تھے تو مَیں نے تمہیں پہچان لیا تھا کہ تم خان بہادر شجاعت علی خان کے فرزند ہو مگر یہ بات تم کو اِس لئے نہ بتائی کہ نہ جانتی تھی کہ تمہارا ردِّ عمل کیا ہو اور تم آئے تھے دربارِ رسالت حاضری دینے اور ابھی تم نے حج بھی کرنا ہے۔ لہٰذا میں تمہاری توجہ کسی طرح بھی اپنی طرف مبذول نہ کرانا چاہتی تھی۔ اب تم نے روضۂ رسالت مآب پر پوری توجہ سے حاضری دے لی، مسجدِ نبوی میں جی بھر کے نمازیں ادا کر لیں، دُعائیں مانگ لیں، مناسکِ حج سے فارغ ہو لئے۔ اب میں تمہارے رُو برو تمہاری ماں کی حیثیت سے آنا چاہتی ہوں اور اعتراف کرنا چاہتی

ہوں کہ میں تمہیں اُس وقت چھوڑ آئی جب تم ابھی چار سال کے بھی نہ ہوئے تھے۔

میں اِن سے شادی کرنا چاہتی تھی مگر تمہارے والد نے اپنے اثر و رسوخ سے میرے والد کو راضی کر لیا کہ میری شادی اُن سے ہو جائے؛ شادی میری آہ و زاری کے باوجود کر دی۔ اُن کی دولت، اُن کی جائیداد اور اُن کی عنایات میرے دل سے ان کی محبت کو محو نہ کر سکیں۔ لہٰذا ایک رات میں تمہیں ہاجراں کے سپرد کر کے چلی آئی۔ مجھے یقین ہے کہ ہاجراں نے تمہاری دلجوئی اور پرورش میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی ہو گی۔ اُس کو مجھ سے بہت گہری محبت تھی۔ وہ میرے لئے جان بھی دے سکتی تھی۔ اُس نے میری جُدائی کو میرے لئے اور تمہارے لئے کہ اُس کو تم سے انتہاء محبت تھی، قبول کر لیا۔

جب تمہارے والد نے مجھے طلاق دے دی تو میرے والد نے میری مرضی کے مطابق میرا نکاح ان سے کر دیا اور ہم مدینے میں آباد ہو گئے۔ میں تمہیں اپنے ساتھ اس لئے نہ لائی کہ تم مجھے ہمیشہ اپنے والد کی یاد دِلاتے اور میں تم سے انصاف نہ کر سکتی لیکن پھر بھی میں تم سے ان تمام دُکھوں اور صدموں کی معافی مانگتی ہوں جو اِن چالیس برسوں میں تم نے میرے نہ ہونے سے اُٹھائے؛

میں جب تک ہندوستان میں رہا میں آپ کو معاف نہیں کر سکا لیکن برجیس کے ساتھ شادی کے بعد جب میں وہاں سے انگلستان اور پھر فرانس میں آباد ہوا تو آہستہ آہستہ مجھے احساس ہونے لگا کہ آپ میرے باپ کو چھوڑ کر کیوں چلی آئی تھیں۔ جب میں اپنی شخصیت کی ترقی اور ارتقا کے لئے اپنے والد کے کردار کے اثرات کو بڑی کوشش کے بعد اپنے اندر کے نظام سے خارج کرنے میں کامیاب ہوا تو میں نے محسوس کیا کہ آپ کے خلاف میرے

دل میں جو جذبات تھے اُن کو خارج کر دینا لازم آتا تھا کہ کسی سے بغض کو پرورش کرنا اپنے آپ پر مسلسل ظلم کرتے رہنے کے مترادف ہے اور اِس ظلم کا کوئی مداوا اور علاج نہیں کہ جو ظلم ہم دوسروں پر کرتے ہیں وہ شاید ہمیں معاف کر دیں مگر جو ظلم ہم خود اپنے آپ پر کرتے ہیں اُس کو کون معاف کر سکتا ہے۔ اُس کو تو اپنی ہی مسلسل کوشش اور تپسیا جوئی سے ہی محو کیا جا سکتا ہے مٹایا جا سکتا ہے اور یہ مہم بھی آسان نہیں ہے۔ جب میرے یہاں پہلا بچہ پیدا ہوا تو میں برجیس کے پاس تھا۔ میں اُسے تیرہ چودہ گھنٹے دردِ زہ میں کراہتے، تڑپتے دیکھا کیا اور میں اُن کے درد کو بانٹ نہ سکا مگر میں نے اُس درد کو کسی سطح پر اپنے اندر محسوس ضرور کیا۔ اِس سے میں نے محسوس کیا کہ آپ نے بھی مجھے کس تکلیف میں جنا ہوگا اور جب چھوڑا ہوگا تو کس تکلیف اور عذاب میں۔ اِس شعور کے بعد میں نے اللہ سے مسلسل دُعا کی وہ مجھے اُس بغض سے نجات دلائے جو مجھے برسوں سے آپ کے خلاف رہا۔ میں نے بھی اِس معاملے میں بھرپور کوشش کی۔ اللہ نے رحم کیا اور میں نے آپ کو دل سے معاف کر دیا۔

جب آپ نے میرے آبائی شہر کا نام جان لینے کے بعد میرے گاؤں کے بارے میں خلافِ معمول کرید نہ کی (کہ عورتوں کو خاص طور پر اور لوگوں کو بالعموم وطن سے دُور کسی ہم وطن کو پا کر یہ جاننے کی کرید ہوتی ہے کہ ہم وطن کہاں کا رہنے والا ہے) تو مجھے اندازہ ہوا کہ شاید آپ یہ جاننا نہیں چاہتیں کہ میں کون ہوں۔ اُس کے بعد آپ جس طرح بلاتکلف اور محبت سے مجھے اور برجیس سے اور بعد میں عائشہ سے ملتی رہیں مجھے اِس کا گمان بھی نہ تھا کہ ماں کے رُو برو ہوں۔ آپ نے مجھے بیٹا کہنے کی جُراُت کی ہے تو میں بھی آپ کو ماں کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

'ماں بیٹے کی محفل میں ہمارا کیا کام۔ آیئے چلیں بعض دوستوں کی بیگمات عائشہ سے ملنے کے لئے اور بعض برجیس سے ملنے کے لئے بے تاب ہیں کہ سوکنوں میں محبّت اُن کے لئے اچرج بات ہے اور اُن کے دل اِس اچرج ماجرے پر ایمان لانے کے لئے تیار نہیں ہیں اور وہ قائل ہونا چاہتی ہیں۔ اُن کو اپنے اِن نادر اور عظیم انسانوں کی ملاقات اور درشن سے محروم رکھنا ظلم ہوگا اور آپ دونوں یہ ظلم کرنا پسند نہ کریں گی۔ تم بھی آؤ فاطمہ۔ ایسا منظر شاید تم پھر کبھی نہ دیکھ پاؤ۔ کاش تم اِن دونوں کے سایے میں کچھ دن اور رہ سکتیں'۔

سب ہمیں تنہائی میں چھوڑ کر چلے گئے۔

میں اللہ کی شکر گذار ہوں کہ اُس نے تم سے ملا دیا۔ اِس لئے نہیں کہ میں تمہاری محبّت میں بے قرار تھی۔ جب سے میرے بچّے جوان ہوئے ہیں تم مجھے اکثر یاد آتے رہے ہو کہ میں تمہیں تمہارے والد کے پاس چھوڑ آئی جبکہ خود میں نے اُن کے پاس رہنا عذاب جانا۔ میں نے اکثر اپنے آپ کو تسلّی دی کہ ہاجراں نے تمہاری حفاظت کی ہو گی، پیار اور شفقت دی ہوگی کہ یہ اُس کا شعار تھا۔ مگر میں پھر بھی چاہتی تھی کہ تم سے ملوں اور مامتا سے بے وفائی کرنے کے لئے تم سے معافی مانگوں۔ اِس احساسِ بے وفائی کو لے کر میں مرنا نہیں چاہتی تھی۔ اِس کا خمیازہ میں اِسی دُنیا میں بھگتنا چاہتی تھی'۔

'ہاجرہ امّی نے مجھے وہ سب کچھ دیا جو اِک ماں دے سکتی تھی، شاید اِس سے بھی زیادہ۔ مگر آپ کی بے وفائی مجھے ہمیشہ اپنی ذاتی توہین محسوس ہوتی رہی۔ اُس لمحے تلک جب مجھے برجیس نے قبول کر لیا۔ برجیس سر محی الدین کی سب سے چھوٹی بیٹی ہے۔

'اُس نے اِس کا کبھی ذکر نہیں کیا مجھ سے۔ اُس کو اپنے آپ پر بہت قابو اور ضبط ہے۔ وہ محبت کرنا اور دینا جانتی ہے۔ عائشہ سے اُس کی محبت دیکھ کر میرا دل کئی بار چاہا کہ مَیں اُس کے قدموں میں جُھک جاؤں مگر مجھے ہمیشہ اِس احساس نے روک لیا کہ کسی انسان کے آگے جُھکنا گناہ ہے، چاہے جذبہ کتنا ہی پاک کیوں نہ ہو۔ میں نے ایسی عظیم عورت کبھی نہیں دیکھی مَیں اللہ کی رحمت کے لئے شکر گذار ہوں کہ اُس نے مجھے برجیس کے ساتھ چند دن اکھٹے رہنے کی سعادت بخشی۔ عائشہ کو دیکھ کر مَیں نے ہمیشہ محسوس کیا کہ کاش مَیں نے اُس کو جنا ہوتا۔ اُس کے قبولِ اسلام نے مجھے جو خوشی دی اُتنی خوشی تو مجھے اُس دن بھی نہ ہوئی تھی جب میں فاطمہ کے باپ رُو برو تھی اور اُن کی بیوی تھی۔ برجیس یقیناً اللہ کی یگانہ مخلوق ہے۔

'وہ یگانہ ہے۔ وہ اپنے باپ کے یہاں سے کچھ بھی لے کر نہیں آئی تھی۔ اپنا نام بھی وہ وہیں چھوڑ آئی تھی۔ اُس کا نام طاہرہ تھا۔ اُس نے مجھ سے نکاح کیا تو وہ برجیس تھی۔ اُس کے والد کو یہ شادی پسند نہ تھی؛

'میرا بڑا بیٹا لندن میں طب کا سب سے اعلیٰ امتحان پاس کرنے کی تیاری کر رہا ہے۔ میں اُس کو لکھوں گی سب حالات اور کہوں گی کہ وہ وہاں سے فارغ ہو کر جب واپس لوٹے تو آپ سب سے مل کر آئے۔ میرا چھوٹا بیٹا باپ کے ساتھ کاروبار میں شریک ہے اور آج کل قاہرہ میں ہے۔ اگر کبھی وہ پیرس جا سکا تو تم سے ضرور ملے گا۔ رشتہ داری کے حوالے سے نہیں بلکہ اُس دوستی کے حوالے سے جو اللہ نے اپنی رحمت سے تمہارے اور میرے خاندان کے درمیان، میرے ارادے کے بغیر پیدا کر دی ہے۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؛'

'اس کی کوئی وجہ اور جواز ہی نہیں۔ مجھے مسرت اور فرحت ہوگی اپنی

ماں جائیوں سے مل کر!

۸

جب ہم پیرس پہنچے تو طاہرہ نرسری جانے لگ گئی تھی اور اپنی سہیلیوں اور دوستوں سے خوش تھی، اگرچہ اب بھی اس کی اصل دوستی اپنی بہن اور بھائیوں سے تھی۔
عائشہ نے برجیس سے قرآن پڑھا اور مجھ سے عربی اور ہر لمحہ قرآن کے مطالب میں ڈوبی رہتی۔ اُس نے ہسپتال اور کلینک میں اپنے اوقات کو اس طرح ترتیب دیا کہ اُس کو گھر پر زیادہ سے زیادہ وقت مل سکے۔ وہ صوم وصلوٰۃ کی بہت پابند تھی۔ قرآن کا مطالعہ وہ بہت اہتمام سے کرتی تھی۔ اُس کو جہاں قرآن کے مطالب سمجھنے میں اُلجھن ہوجاتی وہ اُس کے لئے برجیس اور مجھ سے مسلسل سوال کرتی رہتی تاآنکہ مفہوم اُس پر نازل ہوجاتا۔ اِس سے جتنا وقت بچتا وہ بچوں میں مصروف رہتی۔ تہجد کے لئے وہ اہتمام سے اُٹھتی اور فجر کی نماز کے بعد ہی جا نماز سے اُٹھتی۔ قرآن کی قرأت صحت سے کرنے کے لئے اُس نے بہت کوشش کی اور آخر کامیاب ہوئی۔
مجھے اکثر لگتا کہ وہ مراقبے میں ہے۔ کبھی لگتا کہ وہ وجد میں ہے اور اپنے آپ سے، ماحول سے بے خبر ہے، اِس جہانِ رنگ و بو سے ماوراء ہے۔ میں اِس سے فکر مند ہوا۔ برجیس نے مشورہ کیا تو اس نے بتایا:۔
'میں نے بھی اُس کی ان کیفیات پر بہت غور کیا ہے۔ میں نے چچا میاں سے معلوم کیا ہے۔ عائشہ نے اپنی خوراک کافی کم کردی ہے یا اُس کی خوراک کم ہوگئی ہے۔ جب وہ ہمارے ساتھ کھاتی ہے تو وہ پوری خوراک کھاتی ہے۔ جب بچوں کے ساتھ کھاتی ہے تو وہ بچوں کو اس طرح لبھائے رکھتی ہے

کہ وہ اُس کی خوراک پر نظر نہیں رکھ پاتے۔

اس کی عبادات بہت لمبی ہوتی جارہی ہیں۔ اگر ہم اور بچے نہ ہوں تو شاید ہر لمحہ وہ جائے نماز پر ہی رہے۔ میں نے اس پر بہت غور کیا ہے۔ وہ اللہ اور اُس کے آخری رسول سے تورات اور عہد نامہ جدید کے حکم کے مطابق اپنے پورے قلب، پورے ذہن اور پوری قوّت سے محبّت کرتی ہے۔ اُس نے اسلام قبول کرنے میں بہت جلدی کی۔ اُس کے سب گہرے روّیے عیسائی ہیں۔ وہ حیات الدّنیا اور حیات الآخرۃ کے تقاضوں میں لازمی توازن برقرار نہیں رکھ سکتی۔ اس کے لئے دُنیا کی زندگی آخرت کی زندگی کی راہ میں بہت بڑا پتھر ہے، جس کو وہ اپنی راہ سے ہٹانے کی کوشش میں مصروف رہتی ہے۔ وہ اپنی طبّی ذمّہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کی ضرور بھرپور کوشش کرتی ہے کہ اُس خدا کی مخلوق سے محبّت کرنے کے مترادف ہے جس خدا سے وُہ محبّت کرتی ہے۔ یہ بھی یہودی عیسائی روّیوں کا امتزاج ہے۔ اگر اُس کو خودکشی کا خیال دامن گیر نہ ہو تو وہ آسمانی زندگی تک پہنچنے میں بالکل تاخیر نہ کرے۔ اس پر حیفہ کے ماحول کا اثر بھی بہت گہرا ہے۔ رشِیل کے رشتہ دار حسیدی فلسفے اور طرزِ عمل سے بھرپور نظر آتے تھے اور فلسطین میں حیفہ صوفیوں کا بہت بڑا مرکز ہے اور فضل محمد الہٰدی شیخ حیفہ سے بیعت ہیں۔ عائشہ مسلسل دس دن اُن کی معیت میں سفر کرتی رہی اور یقیناً اُس نے اُس نفسیاتی، روحانی، ماحول کو جذب کیا جس میں فضل محمد صاحب رہتے تھے۔

اُس کا اسلام قبول کرنے کا ارادہ اتنا غیر متوقع اور فوری تھا کہ ہم اُس کو روک نہیں سکتے تھے کہ وہ اسلام پورے غور و خوض کے بعد قبول کرنے کا فیصلہ کرے، جیسے قرآن کا تقاضہ اور ہدایت ہے۔ اُس نے اپنے سب سے گہرے

اور طاقت ور جذبات اور محرکات کو مُسلم کئے بغیر اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اُس کے عیسائی جذبات اور رویے اُس کے اسلام کا تعین کرتے ہیں اور وہ نہیں جانتی۔ وہ اِس دُنیا کی زینتوں سے پہلے بھی بے پروا تھی اور ان کو حرام ہی سمجھتی تھی اور اب بھی اُس کی کیفیت یہی ہے۔ اُس کے لئے زشت و خوب، خیر و شر کا معیار پہلے بھی خداوند تھا اور اُس کے اکلوتے بیٹے کی محبّت تھی اور اب بھی وہ اللہ اور اُس کے اکلوتے حبیب سے محبّت کرتی ہے اور ہر اُس جذبے اور توجّہ سے رُوگرداں ہے جس پر اُس کو گماں ہوتا ہے کہ وہ اُس کی اُس محبّت کا حریف ہے یا اُس میں شریک ہونا چاہتا ہے۔

مجھے ڈر ہے کہ وہ اپنی خوراک خطرناک حد تک کم نہ کر دے۔ میں نے چچا میاں اور بچّوں سے کہا کہ جب بھی وہ کم کھائے تو مجھے ضرور علم ہونا چاہیئے۔ تم اُس سے اِس معاملے میں بات کرو۔ مَیں اس کی ماں ہوں، بہن ہوں اور دوست ہوں مگر تم اُس کے محبوب اور مرشد۔ تمہاری بات وہ دل و جان سے سُنے گی مگر میری بات اُس کے دل میں اُترے گی نہیں، کیوں کہ وہ اِس کی اجازت ہی نہیں دے گی۔

ایک رات جب وہ عشاء کی نماز سے فارغ ہوئی تو اُس نے مجھے اپنے کمرے میں اِک کرسی پر بیٹھے دیکھا اور پریشان ہوئی:۔

'خیریت تو ہے'، تم پریشان دکھائی دیتے ہو' بچّے تو خیریت سے ہیں' برجیس تو خیریت سے ہے؟

' وہ سب خیریت سے ہیں۔ میں تمہاری وجہ سے پریشان ہوں۔ تم اِس ارضی حیات سے بالکل بے پروا ہوتی جارہی ہو۔ صرف اپنی طبّی ذمّہ داریوں

کو توجہ سے ادا کرتی ہو۔ وہ بھی اِس لئے کہ مریض اُس خدا کی مخلوق ہیں جس سے تم پورے دل و دماغ اور پوری قوت سے محبت کرتی ہو اس لئے کہ وہ اپنی مخلوق سے محبت کرتا ہے۔ تم نے اپنی خوراک خطرناک حد تک کم کر دی ہے۔ تم ارضی زینتوں سے بالکل بے پروا ہو گئی ہو۔ ایسا لگتا ہے کہ تم نے اِن کو حرام قرار دے لیا ہے۔ اللہ نے اِن کو حرام قرار نہیں دیا اور بالاصرار کہا ہے کہ کون ہے جو اِن کو حرام قرار دے سکتا ہے۔ حیات الدنیا اور حیات الآخرۃ دونوں لازم و ملزوم اور زوجین ہیں اور دونوں کے تقاضے پورے کرنے لازم ہیں، صرف اِس شرط کے ساتھ کہ جب حیات الدنیا کے کسی تقاضے اور حیاتِ آخرت کے تقاضوں میں تصادم ہو تو حیات الدنیا کے اُس تقاضے کو قربان کر دیا جائے۔ یہ دُنیا کھیتی ہے۔ اِس میں بونا لازم آتا ہے لیکن اِس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صرف ایک ہی قسم کی فصل بوئے چلے جاؤ۔ اپنی صلاحیتوں کے مطابق مختلف فصلیں بونا لازم آتا ہے، سوائے اُس فصل کے جو انسانی شخصیت یا ذات کو مضمحل کر دے۔ دُنیا کی زینتوں سے لُطف اندوز ہونا گناہ نہیں۔ ہاں اُن میں اِس حد تک کھو جانا کہ حیاتِ آخرت کے تقاضے فراموش ہو جائیں، اِس کی اجازت یقیناً نہیں ہے مگر تم تو اِن سے یکسر اجتناب کرنے لگ گئی ہو۔ یہ ظلم ہے اور تم اپنی ذات پر کر رہی ہو۔ تم اِس ظلم کے عواقب سے کیسے بچ سکو گی۔ اللہ کے قانون کے مطابق اعمال ہی کے مطابق جزا ملتی ہے۔

اِس ارض و سما، کائنات کی تخلیق، بقول قرآن، بالحق ہے کہ اِس میں اللہ کے قوانین جاری و ساری ہیں۔ اِس ارض پر ہر وہ شے جو حرام نہیں ہے اور صحت کے لئے مفید اور من بھاتی ہے اُس کا کھانا اُس

سے مزالینا کوئی جرم اور گناہ نہیں - مزا نہ لینا اللہ کی نعمتوں سے انکار ہے۔
اُس نے یہ نعمتیں اپنے اطاعت گزار بندوں کے لئے طیّب قرار دی ہیں۔
جو اس دُنیا میں اللہ کی نعمتوں سے پرہیز کریں گے تو آخرت میں نعمتیں اُن سے پرہیز کریں گی۔ کچھ تو خوفِ خدا کرو۔ اللہ جب تم سے پوچھے گا کہ تم نے دُنیا میں قرآنی معاشرے کو وجود میں لانے کے لئے کیا کوشش کی تو کیا جواب دو گی؟ یہ کہ میں نے دُنیا میں ہر نعمت اور زینت سے مُنہ پھیر لیا تھا اور تیری عبادات میں مصروف رہتی تھی۔

اللہ کو تمہاری محبّت نہیں چاہیئے وہ قرآن میں ایمان لانے والوں کو صرف اُن کی فلاح کے لئے ہدایت کرتا ہے کہ اُس کے قوانین کی اطاعت کریں۔ انسان کی ساخت ایسی ہے کہ اُس کی بہترین کارکردگی صرف قوانینِ الٰہی کی اطاعت کے ذریعے سے ہی ممکن ہے۔ محبّت کا وہ تقاضہ نہیں کرتا۔ یہ ارض اور اُس سے اُگنے والا آدم' دونوں شر نہیں ہیں۔ شر انسان کے اُن اعمال سے وجود میں آتا ہے جو قوانینِ الٰہی کے خلاف ہوں۔ آدم کا جسم شر نہیں کہ مرنے کے بعد اِسی جسم میں دوبارہ اُٹھایا جائے گا۔ اللہ بار بار اِس کا اعلان کرتا ہے۔ اِسی امکان کا انکار کفار کرتے تھے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ جب ہمارا بدن اور ہڈیاں گل سڑ جائیں گی تو اِس جسم کی رستاخیز ہوگی۔ اِسی جسم کے ساتھ آدم اللہ کے رُو برو جائے گا۔ روزِ قیامت Matter اور Spirit کی ثنویت کی قرآن تصدیق نہیں کرتا۔ لٰہذا یہ ثنویت باطل ہے' یہ یونانی' یہودی' عیسائی تصوّرات ہیں' جس کو قرآن تسلیم نہیں کرتا۔ نفس اندرونی انسان ہے اور بشر بیرونی انسان۔ روحِ انسانی اور روحِ الٰہی کا قرآن میں کہیں ذکر نہیں۔ اللہ روح نہیں ہے۔ بائیبل میں انسان اور خدا دونوں کو

دونوں کو روح قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا دونوں تصوّرات قرآنی نہیں ہیں۔ اِس لئے اُن کو کسی سطح پر قبول کرنا اور اُس کے مطابق اپنے اعمال کا تعیّن کرنا قرآن سے انحراف ہے۔ انحراف کرنے والوں پر عذاب کا آنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اللہ کے قانون میں قانون سے انحراف کے لئے معافی نہیں۔ سزا کے اثرات کو محو کرنا خیر جوئی ہی سے ممکن ہے۔

ہم اور تم اپنے اوّلین والدین کے گناہ کے سبب گری ہوئی مخلوق نہیں ہیں۔ اگر ہم اُن کے گناہ سے وجود میں آئے تھے اور لہٰذا گناہ سے بچ نہیں سکتے تو اُنہوں نے گناہ کیوں کیا تھا؟ کیوں نہ بچ سکے گناہ سے؟ وہ گری ہوئی مخلوق تو نہ تھے۔ اُن کو تو کسی نے نہ جنا تھا، اُن کو تو خداوند خدا نے خود بنایا تھا۔

اللہ نے ہمیں کچھ حدود کے اندر، جن کا اندازہ آخری انسان کے آجانے سے پہلے ممکن نہیں، بااختیار پیدا کیا ہے۔ چونکہ انسان خود اپنی حریت اور خود مختاری کے لئے صحیح حدود کا اندازہ نہیں کر سکتا تھا، اِس لئے اُس کے لئے ہدایت نازل ہوتی رہی۔ اب آخری ہدایت آچکی اور اُس کی حفاظت کا وعدہ اللہ نے کیا ہے۔ اُس کی تفسیر و تشریح کا بھی اُس نے ذمّہ لیا ہے۔ یہ تفسیر و تشریح اللہ تصریفِ آیات کے ذریعے سے کرتا ہے۔ لہٰذا قرآن کے معنی بالکل صاف اور نکھر کر سامنے آتے ہیں اور اس میں کسی طرح کا ابہام ممکن ہی نہیں ہوتا اگر دل اور ذہن کجی کی طرف جھکے ہوئے نہ ہوں۔ اُس کی ہدایت ہی کے انحراف سے شر وجود میں آتا ہے۔ اُس کی اطاعت سے شر پر خیر کا غلبہ رہتا ہے اور وہ حدود میں محصور رہتا ہے اور جب خیر میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے تو شر پر یہ حدود تنگ ہوتی چلی جاتی ہیں اور شر

بے بس ہو جاتا ہے۔ اِس انجام کے لئے مسلسل کوشش لازم اور ناگزیر ہے، اللہ کے قوانین کے مطابق۔

لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ حریت اور خود مختاری بذاتہٖ شر کی خالق ہے۔ بالکل نہیں۔ جب حُریتِ اِنسانی اللہ کے قوانین کی حدود میں رہتی ہے تو صرف خیر ہی نازل ہوتا رہتا ہے۔

اللہ ہی با اختیار ہے۔ اُس کی رحمت ہے کہ اُس نے انسان کو بھی با اختیار بنا کر اِس کا اہل کیا کہ وہ اُس کے اَسما کو اپنے اندر اُجاگر کر لے اور اُس کے رنگ میں رنگا جائے اور ارض و سما کو مسخر کر لے۔ اور اِس تسخیر کے اثمار کو انسانیت کی بہبود کے لئے وقف کر دے اور یوں اللہ کا رفیق، رفیقِ اَدنیٰ، بن جائے۔

لہٰذا جو اِس حُریت اور اختیار سے خائف ہے وہ قوانینِ الٰہی کے مطابق عمل پیرا نہیں ہے اور کوشش کر رہا ہے کہ کائنات کے مظاہر کی طرح بے اختیار ہو کر، اطاعتِ خداوندی کرے، وہ اللہ کی اِس عظیم نعمت اور اپنی انسانیت سے اِنکار کرتا ہے اور یہ اللہ کے اُس فیصلے کا اِنکار ہے جو اُس نے اُس کو اختیار دینے اور سما و ارض کو اُس کے لئے مسخر کر دینے کے لئے کیا۔ اِس سے بڑا انکار ممکن ہی نہیں کہ یہ اللہ کا انکار تو ہے ہی مگر اِس کے ساتھ ساتھ انسان کی انسانیت کا بھی انکار ہے۔

میری ہمدم! میری زوج! اللہ کے عذاب کو مت للکار۔ اِس سما و ارض کو قبول کر اور انسان کی حُریت اور اختیار کو بھی۔ یہ آنکھیں، یہ کان، یہ قلب، یہ عقل، یہ فکر و تدبیر کی صلاحیتیں نعمتیں ہیں۔ اِن کو عمل پیرا ہونے کی اجازت دو، اللہ کی مقرّر کردہ حدود کے اندر۔ ایسا نہ ہو کہ اللہ حساب

مانگے اور تم حساب ہی نہ دے سکو!

اُس نے کوئی احتجاج نہ کیا اور واپس جانماز پر گئی اور سجدے میں گر گئی۔ اِس کے گھنٹوں بعد وہ جانماز ہی پر سوئی ہوئی پائی گئی۔ اگلے دن سے اُس کے طرزِ عمل میں خاصا نمایاں فرق تھا۔ اُس کی خوراک بحال ہو گئی۔ اُس کے لباس میں نفاست آتی چلی گئی۔ اُس کے جسم میں پھُرتی، شعور اور چہرے پر رونق رہنے لگی۔ آہستہ آہستہ پرجبیں اور مجھے اطمینان ہوتا چلا گیا۔

ایک دن مجھے خط ملا کہ میرا ماں جایا، سعداللہ، انگلستان سے ایم۔آر۔سی۔پی کر کے وطن واپس جاتے ہوئے پیرس ملاقات کے لئے آئے گا۔ جب وہ آیا تو سب سے ملا۔ جب بھی وہ عائشہ کے رُو برو ہوا وہ اُس کو بغور دیکھتا رہا مگر اِس اہتمام سے کہ کوئی دوسرا اِس عمل سے آگاہ نہ ہو پائے۔ جب وہ رُخصت ہوا تو میں اُس کو دروازے تک چھوڑنے گیا۔ اُس نے مجھ سے کہا کہ اُس کو شُبہ ہے کہ عائشہ اُس مرض کے آخری مراحل پر پہنچنے والی ہے جس میں بدن کے مسام بند ہو جاتے ہیں اور انسان کا بدن آکسیجن سے محروم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اِس کا طبّی معائنہ فوراً کرانا لازم ہے۔ مَیں نے ماہرین سے درخواست کی کہ وہ اِک بورڈ تشکیل دیں جو عائشہ کا معائنہ کرے۔ سعداللہ نے بورڈ کو اپنے شبہات اور مشاہدے سے آگاہ کیا۔ معائنے اور کئی امتحانوں کے بعد بورڈ نے سعداللہ کے شبہات کی تصدیق کر دی اور مشورہ دیا کہ انگلستان کے ماہرین سے بھی مشورہ کر لیا جائے۔ ہم دونوں عائشہ کو لے کر انگلستان گئے۔ وہاں انھوں نے بھی تشخیص کی تصدیق کی اور علاج تجویز کیا مگر اُس سے کسی ایسے افاقے کا دلاسہ نہ دیا جو اُس کی صحت کو بحال کر سکے؛ صرف اتنا کہا کہ مریضہ کی نفسیاتی مدافعت

پر منحصر ہے کہ وہ رو بصحت ہوتی ہے کہ نہیں۔ مرض لا علاج تھا۔

ہم اس کو واپس پیرس لے آئے۔ چند دن سعد اللہ نے اُس کے علاج کی نگرانی کی۔ اِس کے بعد وہ مدینے چلا گیا۔ جاتے ہوئے مجھ سے کہا:۔

'بھابھی کے اندر جینے کی آرزو بہت ہی معدوم ہے، نہ ہونے کے برابر۔ میں طبیب ہوں، روحانی معالج نہیں ہوں۔ لگتا ہے کہ وہ ارضی زندگی سے رُخصت ہونے کے لئے بیتاب ہیں۔ ایسا کیوں؟ وہ آپ سے بہت محبت کرتی محسوس ہوتی ہیں مگر ساتھ ساتھ الوداع کہتی بھی محسوس ہوتی ہیں۔ آپ اور برجیس بھابھی اِس کا فیصلہ کرنے کے لئے مجھ سے زیادہ اہل ہیں کہ آپ دونوں اُن کو برسوں سے جانتے ہیں۔

طبّی طور پر حالت پُر اُمید نہیں ہے۔ معجزہ ہی بھابھی کو بچا سکتا ہے۔ میری پرورش صوفی ماحول میں ہوئی۔ اِس ماحول میں معجزہ اور کرامت زندگی کا معمول ہے مگر طب میں اِس کا کوئی جواز نہیں ہے۔ قرآن سے بھی میری شناسائی ہے۔ وہاں بھی معجزے کے امکان کی تصدیق نہیں ہوتی۔ اللہ اپنے قوانین پر اس قدر زور دیتا ہے کہ معجزے کا تصوّر بھی ممکن نہیں۔

اللہ سے دُعا کریں کہ وہ بھابھی کو تکلیف سے محفوظ رکھے۔ اب تو یہی آپ کر سکتے ہیں۔

آپ کے گھر کے ماحول سے اندازہ ہوتا ہے کہ بھابھی نے ایک اچھی زندگی گذاری ہے۔ لوگ اُن سے محبت کرتے ہیں اور ہر دم دُعا بھی کرتے ہیں۔ اُن ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں'

اِس کے بعد عائشہ آہستہ آہستہ موت کے قریب ہوتی چلی گئی۔ اُس کی یہ حالت کئی ہفتے تک رہی۔ اُس کے اور موت کے درمیان جب اِک تار کا

رشتہ رہ گیا تو برجیس اور رشیل نے ہسپتال اور کلینک جانا چھوڑ دیا اور ہر دم اُس کے پاس رہتیں۔

ایک دن ہسپتال کی ایک نرس مارتھا، اِک مہمان کو لے کر آگئی۔ یہ میری ماں کا دوسرا بیٹا عباد اللہ، تھا۔ وہ اپنے حلقۂ صوفیاں کی طرف سے دو سال کے لئے پیرس تعینات ہو کر آیا تھا۔ اُس کی والدہ نے عائشہ کے لئے ایک تسبیح بھجوائی تھی جو کئی ہفتے رسول اللہ کے اندرونی روضے پر رکھی رہی تھی۔

مارتھا بھی عائشہ کو دیکھنا چاہتی تھی۔ مَیں دونوں کو لے کر عائشہ کے کمرے میں داخل ہوا۔ بچے، برجیس، رشیل، اُس کا والد، مسز لوگار اُس کے پلنگ کے گرداگرد بیٹھے تھے۔ طاہرہ بتول کی گود میں بیٹھی تھی۔ عائشہ کا دایاں ہاتھ برجیس کے دونوں ہاتھوں میں تھا اور بایاں مسز لوگار کے ہاتھو میں۔ رشیل برجیس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے بائیں ہاتھ سے آہستہ آہستہ تھپک رہی تھی۔ جمیل اور شرجیل اُس کے قدموں میں اُس کی طرف مُنہ کئے اُداس بیٹھے تھے۔ عائشہ پر نقاہت طاری تھی۔

میں نے عائشہ کو بتایا کہ مدینے سے اُس کے لئے میری ماں نے تسبیح بھجوائی ہے جو رسول اللہ کے اندرونی روضے پر ہفتوں رکھی رہی تھی۔ عائشہ نے سُنا اور آنکھوں سے اشارہ کیا کہ اُس کے گلے میں ڈال دو۔ میں نے تسبیح اُس گلے میں ڈال دی۔ اُس کی آنکھوں میں سوال تھا: کون لایا ہے۔ میں نے بتایا۔ اُس کی نگاہوں نے پوچھا: کہاں ہے۔ میں نے بتایا کہ وہ مارتھا کے ساتھ دروازے میں کھڑا ہے۔

اُس نے دروازے کی طرف نگاہ کی اور کِھل اُٹھی۔ میں نے دیکھا:

اُس کی آنکھوں میں حیرت تھی اور تشکّر اور اک مسکراہٹ اُس کی آنکھوں سے پھوٹی اور اس کے چہرے پر پھیلی۔ اس نے برجیس کی طرف دیکھا، جیسے کہہ رہی ہو: میں چلی، مجھے لینے کے لئے آگئے ہیں۔

برجیس نے باآوازِ بلند لیٰسین پڑھنا شروع کی۔ عائشہ نے غور سے سُنا اور پھر دروازے کی طرف دیکھا اور مسکرائی۔ مَیں نے بھی دروازے کی طرف دیکھا۔ میرے تخیّل اور ذہن میں کوندا اور میرے قلب نے پکارا: یسوع مسیح اور مارتھا! میرے بھائی کے نوجوان چہرے پر بھورے بھورے بالوں کی ڈاڑھی نمایاں طور پر نظر آرہی تھی۔ اس کے چہرے پر انتہاء دردمندی اور حلم تھا اور اُس کی آنکھوں میں روشن گہرائی۔ مارتھا کی قلب ہیئت ہوچکی تھی اور وہ ہمہ تن حیرت و جلال تھی۔

مَیں نے نگاہ بالارادہ عائشہ کی طرف لوٹائی۔ اُس کی آنکھیں کلام کرتی تھیں: دیکھو! مجھے کون لینے آیا ہے۔ اب جانا ہی ہوگا۔ الوداع! اللہ حافظ!

اُس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ برجیس خاموش ہوچکی تھی۔ عائشہ کی مدھم آواز میں کلمہ صاف سُنائی دے رہا تھا، جیسے کہہ رہی ہو، گواہ رہنا! میں مُسلم مرتی ہوں۔ کسی کے تن سے آواز نہ نکلی۔ سب کی آنکھوں سے آنسو چھلک آئے۔ چچا میاں نئی نویلی گرم چادر لے آئے تھے۔ اُس کو برجیس کی طرف بڑھا دیا۔ برجیس نے عائشہ پر چادر ڈال دی اور اُن کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی جاری ہوئی۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ وہ مرحومہ کے لئے دُعا کر رہی تھی۔

۹

اگلے روز عید الاضحیٰ کی نماز کے بعد ہم عائشہ کو دفن کرکے قبرستان سے جو نکلے تو پیرس میں بہار آئی تھی۔